خدمت ہو مقصدِ حیات میرا

ڈاکٹر روتھ فاؤ کا زندگی نامہ

مطہر ضیا

ترجمہ: صائمہ ارم

بے کسوں کی دستگیری

ڈاکٹر روتھ فاؤ کا زندگی نامہ

بے کسوں کی دستگیری

ڈاکٹر روتھ فاؤ کا زندگی نامہ

ڈاکٹر مطہر ضیا
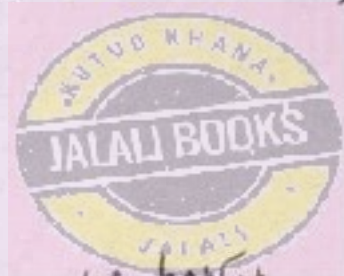
ترجمہ: صائمہ ارم

بے کسوں کی دستگیری

ڈاکٹر روتھ فاؤ کا زندگی نامہ

پہلی اشاعت: 2013
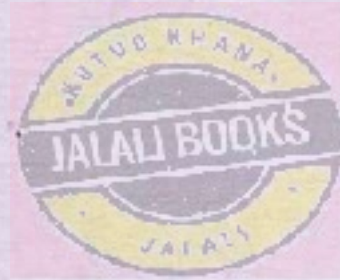
زیرِ اہتمام
آج کی کتابیں

طباعت
ذکی پرنٹرز، کراچی

سٹی پریس بک شاپ

316، مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ، صدر، کراچی 74400

فون: 35213916 ,35650623 (92-21)

ای میل: ajmalkamal@gmail.com

ترتیب

۱

گلاب نہیں، بوگن ویلیا

۸ مارچ ۱۹۶۰ کی دھوپ بھری سہ پہر کو اطالوی ایرلائن ال اتالیا کی ایک پرواز کراچی ایرپورٹ پر اترتی ہے۔ سفید رنگت والے یورپی مسافر، جو سیدھے پیرس سے آ رہے ہیں، جہاز سے اترنا شروع کرتے ہیں۔ ان میں کانونٹ کی ایک تیس سالہ جرمن شاگردہ روتھ فاؤ بھی ہیں جو ہندوستان جاتے ہوئے یہاں عارضی طور پر رکی ہیں۔ ان کے پاس مختصر سے سامان کے علاوہ تین عہد ہیں جو انھوں نے پیرس میں ''ڈاٹرز آف دی ہارٹ آف میری'' نامی کانونٹ کی شاگردہ کے طور پر اپنے پہلے برس کے دوران کیے ہیں۔ ناداری، پاکبازی اور اطاعت کے عہد۔

وہ جس مسیحی تنظیم سے وابستہ ہیں اس کی بنیاد فرانسیسی انقلاب کے دوران میری ایڈیلیڈ (۱۷۴۹۔۱۸۱۸) نے رکھی تھی، اور اس کے ضوابط ان پرنوں کا روایتی لباس پہننے اور تنہائی کی زندگی گزارنے کی شرائط عائد نہیں کرتے۔ ان کا مشن دنیا میں کسی بھی جگہ انسانی مصائب کے خلاف کام کرنا ہے۔

جرمنی کی ایک یونیورسٹی سے طب کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد روتھ فاؤ کو

ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہوں سے درخواستیں موصول ہوئی ہیں کہ وہ وہاں آ کر کام کریں۔ انھوں نے کراچی میں اپنی کمیونٹی کی درخواست یہ سوچ کر منظور کر لی ہے کہ یہاں سے وہ ہندوستان کا ویزا آسانی سے حاصل کر سکیں گی۔

ایر پورٹ سے انھیں سیدھے گرومندر پر واقع لڑکیوں کے ہاسٹل لے جایا جاتا ہے جو بابائے قوم قائد اعظم محمد علی جناح کے مزار سے پیدل کی دوری پر واقع ہے۔ راستے میں انھیں گھروں کے باہر لگی بیلوں پر بوگن ویلیا کے پھولوں کے گچھے دیکھ کر ان پر گلاب کے پھولوں کا گمان ہوتا ہے۔ موسمِ سرما کے گرم کوٹ میں ملبوس روتھ فاؤ کو کراچی کی استوائی گرمی کی حدت ناقابلِ برداشت معلوم ہوتی ہے۔ اپنے طویل سفر کی تھکان کے علاوہ انھیں بھوک بھی محسوس ہو رہی ہے اور متلی بھی۔ لیکن ہاسٹل کی سپیریئر مدر میری ڈائل اصرار کرتی ہیں کہ وہ کھانے سے پہلے دعا کی مجلس میں شریک ہوں۔ برِاعظم ایشیا میں ان کا پہلا دن خاصا پرمشقت ثابت ہو رہا ہے۔ ان کی رات دم گھونٹ دینے والی گرمی اور کمرے کے نصف دیوار والے پارٹیشن کے دوسری طرف بجتے ہوئے ریڈیو کی آواز سے لڑتے ہوئے گزرتی ہے۔ نیم غنودگی کے عالم میں روتھ فاؤ کو پاکستان کی سرزمین کچھ زیادہ مہمان نواز محسوس نہیں ہوتی۔

آنے والے ہفتوں کے دوران وہ خود کو زبان کھولنے سے قاصر اور اکتایا ہوا محسوس کرتی ہیں۔ مشرقی جرمنی میں واقع اپنے اسکول میں انھوں نے جو ابتدائی انگریزی سیکھی تھی وہ کب کی ان کے ذہن سے فراموش ہو چکی ہے۔ پیرس میں اپنے قیام کے دوران جو تھوڑی بہت فرانسیسی انھوں نے اِدھر اُدھر سے سیکھ لی تھی اس کے سہارے وہ برنیس سے بات چیت کر پاتی ہیں جو میکسیکو سے آئی ہوئی فارماسسٹ ہیں اور روتھ کو چھوڑ کر اس گروپ کی واحد غیر امریکی رکن ہیں۔ برنیس اپنی مادری زبان ہسپانوی کے علاوہ فرانسیسی میں بھی مہارت

رکھتی ہیں۔ روتھ کو بول چال کی انگریزی میں اپنی استعداد بحال کرنے میں تین ہفتے لگ جاتے ہیں۔ تب ایک دن برنیس انھیں کراچی کی سب سے بڑی تجارتی شاہراہ میکلوڈ روڈ کے عقب میں واقع جذامیوں کی بستی میں چلنے کی دعوت دیتی ہیں۔

انیس سو ساٹھ کے اس تقدیر ساز دن روتھ فاؤ پاکستان میں رہ کر ان لوگوں کی خدمت کرنے کا فیصلہ کرتی ہیں جن کی خدمت نہ کسی اور نے کی تھی اور نہ کوئی اور کرنے والا تھا۔

۲

مسکراتی ہوئی نیلی آنکھیں

مارتھا اور والٹر فاؤ کے گھر ۹ ستمبر ۱۹۲۹ کو جنم لینے والی روتھ کیتھرینا مارتھا فاؤ ان کی پانچ بیٹیوں میں سے چوتھی تھیں۔ ان پانچ بہنوں کا اکلوتا بھائی شیر خوارگی کے دنوں ہی میں چل بسا تھا۔ والٹر فاؤ مشرقی جرمنی کے شہر لائپزگ کی ایک اشاعتی فرم میں کام کرتے تھے۔ لائپزگ قدیم زمانے ہی سے اشاعتی صنعت کا ایک اہم مرکز رہا تھا۔ اس کا سالانہ کتاب میلہ، جو ہر مارچ میں منعقد ہوتا تھا، ایک جانے پہچانے تہوار کی حیثیت حاصل کر چکا تھا۔ وہاں کی یونیورسٹی ۱۴۰۹ میں قائم ہوئی تھی۔ ۱۹۱۳ میں نئی قائم شدہ جرمن لائبریری کی چھت کے نیچے جرمن زبان کا پورا ادب ذخیرہ کر دیا گیا تھا۔

عظیم جرمن شاعر، ڈرامہ نگار اور مصنف یوہان ولفگانگ فان گوئٹے (۱۷۴۹۔۱۸۳۲) کی مشہور تصنیف ''فاؤسٹ'' میں بیان کردہ لفظوں میں ''لائپزگ مجھے بیحد عزیز ہے، ایک چھوٹا سا پیرس، وہ اپنے شہریوں کی شائستگی کو کتنی عمدگی سے پروان چڑھاتا ہے۔'' مغربی کلاسیکی موسیقی کے باوا آدم یوہان سباستیان باخ (۱۶۸۵۔۱۷۵۰) نے موسیقار کے طور پر اسی شہر میں اپنا مقام حاصل کیا اور اپنی معروف کمپوزیشنیں تیار کیں۔

جو کلاسیکی موسیقی کے شاہکاروں کا درجہ رکھتی ہیں۔ ۱۹۲۹ میں اسی لائپزگ شہر میں روتھ فاؤ نے جنم لیا۔

جب مارتھا فاؤ کی چوتھی بیٹی ان کے پیٹ میں آئی، اس وقت تک اڈولف ہٹلر کی نیشنل سوشلسٹ جرمن ورکرز پارٹی (NSDAP) یا نازی پارٹی کے برسر اقتدار آنے کا بیج بویا جا چکا تھا۔ آسٹریا میں پیدا ہونے والے ہٹلر نے اپنا منصوبہ پوری تفصیل کے ساتھ ۱۹۲۳ میں اپنی کتاب ''مائن کامف'' یا ''میری جنگ'' نامی کتاب میں بیان کر دیا تھا۔ اس منصوبے کے مطابق ''سرطانی جمہوریت'' کا خاتمہ کیا جانا تھا، بالشویکوں (کمیونسٹوں)، یہودیوں اور مارکسسٹوں کو جلاوطن کیا جانا تھا اور پوری دنیا پر جرمن قوم کا غلبہ قائم کیا جانا تھا۔ اس کے بعد کے برسوں میں اس نے اپنی پارٹی کو منظم انداز میں تعمیر کیا۔

روتھ کی پیدائش کے سات ہفتے بعد بیسویں صدی کی بدترین معاشی ابتلا واقع ہوئی۔ ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۹ کو نیویارک کا اسٹاک ایکسچینج کریش ہو گیا۔ وال اسٹریٹ کے اس ''سیاہ منگل'' کے اثرات نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ زرعی اجناس کی قیمتیں زمین پر آ رہیں، فیکٹریوں پر تالے پڑنے لگے۔ لائپزگ میں، جو جرمنی کے صنعتی خطے کے قلب میں واقع تھا، تمام صنعتی سرگرمی تھم گئی۔

لیکن گھر کے پیار بھرے اور تحفظ کا احساس دلانے والے ماحول میں پروان چڑھنے والی روتھ اس 'گریٹ ڈپریشن' کے اثرات سے کم و بیش بے خبری کے عالم میں بڑی ہوئی۔ اس کی زندگی کے ابتدائی سال اپنی بڑی بہنوں کے ساتھ اپنے وسیع خاندانی مکان کے اردگرد لگے باغ کے سیب کے درختوں پر چڑھنے کی سرگرمی میں گزرے۔ اسے اپنے باغ میں اگنے والی چیریوں کا شیریں ذائقہ بہت بھاتا تھا۔ کھٹی چیریوں کو جام بنانے کے لیے توڑا جاتا۔ وہ سب بہنیں باری باری سے اپنے والد کے بنائے ہوئے چھوٹے سے

تالاب میں غوطے لگاتیں اور انھیں ایک دوسرے پر پانی کے چھینٹے اڑانے میں بہت مزہ آتا تھا۔ پھر وہ سب باغ کی چکنی مٹی سے قلعے بناتیں جن کے اونچے دروازوں میں سے چمکیلی رنگدار وردیوں والے ننھے مٹی کے سپاہیوں کو اندر باہر مارچ کرایا جاتا۔

روتھ اکثر پڑوس میں رہنے والی اُرسلا کے ساتھ اس کے خرگوشوں کے قبیلے کو کھانا کھلانے چلی جاتی جو اپنے لمبے کانوں اور چمکتی آنکھوں کے ساتھ ہری گھاس پر قلانچیں بھرا کرتے۔ لیکن اسے خود اپنا پالتو سبز طوطا سب سے زیادہ پیارا تھا جو اپنے پنجرے سے چھلانگ لگا کر نکلتا اور روتھ کی شہادت کی انگلی پر آ بیٹھتا اور وہ اسے اٹھائے فخر سے پورے گھر میں اس کی نمائش کرتی گھومتی۔ لیکن ایک غمناک دن طوطا ایک کھلی کھڑکی سے نکل کر پرواز کر گیا اور روتھ کو اس خیال نے اشکبار چھوڑ گیا کہ وہ رات کو کہاں سوئے گا اور دن میں اسے کون کھانا دے گا۔ اس وقت انھیں معلوم نہ تھا کہ خود انھیں بھی ایک دن اسی طرح اڑ جانا ہے۔ لیکن سبزی فروش نے، جو ہفتے میں دو بار اپنی گھوڑا گاڑی پر محلّے میں سبزی بیچنے آیا کرتا تھا، روتھ کی والدہ کو پہلے ہی سرگوشی میں خبردار کر دیا تھا: ''اپنی چوتھے نمبر والی بیٹی سے ہوشیار رہیے گا۔ وہ آپ کے پسند کیے ہوئے مرد سے شادی نہیں کرنے والی۔ یہ خود اپنے دماغ سے سوچتی ہے۔'' روتھ کے والدین نے بھی ہنستے ہوئے اس خیال کی تصدیق کی کہ ان کی گہرے گھونگھریالے بالوں اور چمکیلی آنکھوں والی بیٹی ایک پرعزم دماغ کی مالک ہے۔

گریٹ ڈپریشن یا عظیم معاشی کساد بازاری نے استحکام کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں۔ معاشی، سیاسی اور سماجی تنازعات بڑھنے لگے۔ ہر طرف شدید بے روزگاری اور سیاسی انتہاپسندی پھیل گئی۔ اس صورت حال کو چابکدستی سے استعمال کر کے ہٹلر نے کلیدی سیاسی حیثیت حاصل کر لی۔ اس کی تصویریں اور پوسٹر ہر طرف دکھائی دینے لگے۔ لیکن روتھ کے

والد سے یہ شخص کسی طرح برداشت نہ ہوتا تھا، بالکل اسی طرح جیسے ان کی بیٹی کو اسکول میں ریاضی اور سلائی کڑھائی کے مضمون ناقابلِ برداشت لگتے تھے۔

۱۹۳۳ کے آتے آتے روتھ چار سالہ باتونی بچی بن چکی تھی اور نازی پارٹی رفتہ رفتہ اتنی طاقتور ہو چکی تھی کہ اس کے زور پر ہٹلر کو جرمنی کا چانسلر مقرر کر دیا گیا تھا۔ ہٹلر نے بہت جلد خود کو تمام آئینی اور پارلیمانی پابندیوں سے آزاد کرا لیا۔ نیشنل سوشلسٹ جرمن ورکرز پارٹی کو ریاستی پارٹی کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ دوسری تمام پارٹیوں پر پابندی لگا دی گئی، ٹریڈ یونینوں کو ممنوع قرار دے دیا گیا اور حزبِ اختلاف کے اخبار زبردستی بند کر دیے گئے۔ ججوں کو فیوہرر کے کسی فیصلے سے اختلاف کرنے کا کوئی اختیار حاصل نہ رہا۔ ریاست نے نگرانی کا ایک طاقتور نظام قائم کر لیا۔ ریاست کے 'دشمنوں' کی فہرست میں کمیونسٹ، یہودی، مارکسسٹ، سیاسی طور پر فعال کلیسا، سیاسی بے اطمینانی میں مبتلا افراد، غلامی کے خاتمے کے حامی اور ہم جنس پرست شامل تھے۔ پولیس، ایس اے اور ایس ایس نامی ایجنسیوں کے ذریعے پارٹی نے مطلق العنان اقتدار حاصل کر لیا۔ ایس ایس خود کو ایلیٹ فورس خیال کرنے لگی۔ روتھ اپنے گھر کی بالکونی سے بھوری وردیوں میں ملبوس سپاہیوں کو سڑک کے اُس پار واقع پارک میں بازوؤں پر سواستیکا کے بلّے لگائے، ڈھول کی تھاپ پر مارچ کرتے دیکھتی اور خوف سے کانپنے لگتی۔

ہٹلر جرمن رائش (سلطنت) اور جرمن قوم کا فیوہرر (قائد) بن بیٹھا۔ نسل پرست نظریے کا پرچار کیا جانے لگا۔ ریاستی تعلیمی ادارے بچوں کو ''جرمن کے سوا کچھ نہ سوچنے، خود کو جرمن محسوس کرنے اور جرمنوں کی طرح برتاؤ کرنے'' کا درس دیا کرتے۔ روتھ نے بھی اپنے اسکول میں یہی تعلیم حاصل کی کہ جرمنوں کی اعلیٰ نسل کو ''رہنے کے لیے گنجائش'' درکار ہے۔ اس کے کمسن ذہن میں خیال آتا: ''ہمارے اردگرد اتنی ساری جگہ تو پہلے ہی

موجود ہے۔ پھر ہمیں رہنے کے لیے مزید گنجائش آخر کیوں درکار ہے؟'' لیکن سوال کرنے کی اجازت نہ تھی۔ سب کو معلوم تھا کہ ریاست کے مخبر ہر جگہ موجود ہیں۔

نوجوانوں کی تمام انجمنوں پر پابندی لگا دی گئی، اور ان سب کی جگہ صرف ''ہٹلر یوتھ موومنٹ'' نے لے لی جو نیشنل سوشلسٹ نظریے کی تعلیم اور فوجی بھرتی سے قبل کی تربیت کا آلہ بن گئی۔ تمام لوگوں کی طرح روتھ کے والدین نے بھی اپنی بیٹیوں کو موومنٹ کا رکن بنوایا۔ بچے سڑکوں پر پارٹی کے نغمے گاتے ہوئے مارچ کیا کرتے، اس بات سے یکسر بے خبر کہ ان کا ملک ایک جنگ کی تیاری کر رہا ہے۔

۱۹۳۳ کے بعد دنیا کی معیشت میں بہتری کے آثار پیدا ہوئے تو جرمنی کی حالت بھی سنبھلنے لگی۔ نیشنل سوشلسٹوں نے عوامی تعمیراتی سرگرمیوں کے ذریعے روزگار پیدا کرنے کا ایک پروگرام شروع کیا جس نے ملک کو ازسرِ نو مسلح کرنے کے منصوبے کے ساتھ مل کر بے روزگاری کی شرح کو خاصا کم کر دیا۔ لیکن یہ تمام سرگرمیاں بیرونی زرِمبادلہ، قرضوں اور نئے کرنسی نوٹوں کی چھپائی کے ذریعے چلائی جا رہی تھیں۔ سرکاری قرضے اتنی اونچی سطح پر جا پہنچے جہاں پہلے کبھی نہ پہنچے تھے۔ روتھ کی اسکول کی تعلیم جاری تھی۔ انھیں ادب اور حیاتیات کے مضامین پڑھنا پسند تھا اور وہ اسکول کے باغ میں بیج بونے، پودوں کو سینچنے اور زندگی کو نمو پا کر بڑھتا ہوا دیکھنے میں وقت صرف کرتی اور اس کا لطف اٹھاتی تھیں۔ اپنی عام سے خدوخال کی حامل موسیقی کی ٹیچر کی رسیلی آواز سن کر ان پر وجد طاری ہو جاتا۔ بیشتر استانیاں روتھ سے بہت لاڈ کرتیں جس پر انھیں بے اطمینانی سی محسوس ہونے لگتی۔ ''آخر میری وجہ سے دوسرے بچے ان کی توجہ سے کیوں محروم رہیں؟'' وہ سوچا کرتیں۔

تب ہی یہود دشمنی کی ایک لہر اٹھی اور یہودیوں اور ان کی املاک کے خلاف پرتشدد واقعات رونما ہونے لگے۔ 'ایرین پیراگراف' یہودی ڈاکٹروں، وکیلوں، صحافیوں اور

فنکاروں کے خلاف قانونی کارروائیوں کی بنیاد کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ مے خانوں، کلبوں اور عوامی پارکوں میں یہودیوں کے داخلے پر پابندی لگا دی گئی۔ آرٹ گیلریوں، لائبریریوں اور تھیٹروں سے یہودیوں کے فن پارے ہٹا دیے گئے۔ یہودی شخصیات کے نام پر بنائی گئی سڑکوں کے نام بدلے جانے لگے۔ نومبر ۱۹۳۸ میں جرمن ایمپائر کی 'کرسٹل ناخت' یا ٹوٹے ہوئے شیشوں کی رات کو پولیس اور ایس اے کے سپاہیوں نے تمام یہودی عبادت گاہوں کو جلا ڈالا، یہودیوں کی دکانوں کو تباہ کر دیا؛ ان کی املاک کو لوٹ لیا گیا اور مالدار یہودیوں کو گرفتار کر کے کنسنٹریشن کیمپوں میں ڈال دیا گیا۔

روتھ کی کلاس میں پڑھنے والی یہودی لڑکی گابی غائب ہو گئی اور پھر کبھی واپس نہ آئی۔ روتھ مسلسل سوال کرتی رہیں کہ گھونگھریالے سنہرے بالوں اور گلابی رخساروں والی ان کی پیاری سہیلی آخر کہاں چلی گئی۔ لیکن انھیں کسی سے اپنے سوال کا جواب نہ ملا۔ جب ان کی بڑی بہن والٹراڈ کی زبان سے ''کنسنٹریشن کیمپ'' کا لفظ نکلا تو ان کی ماں نے پہلی بار اپنی کسی بیٹی کو سخت لہجے میں اپنی زبان بند رکھنے کو کہا۔

بعد میں انھیں پتہ چلا کہ کس طرح یہودیوں کی ایک بڑی تعداد کو کنسنٹریشن کیمپوں میں فائرنگ اسکواڈز کی سیدھی فائرنگ سے یا گیس چیمبروں میں زہریلی گیس چھوڑ کر ہلاک کیا گیا۔ بہت سے یہودی ناکافی غذا یا شدید مشقت کے نتیجے میں ہلاک ہوئے۔ ان سب کی کل تعداد ساٹھ لاکھ تک جا پہنچی۔

گابی کی مسکراتی ہوئی نیلی آنکھیں روتھ کے ذہن پر کئی برس کے لیے مسلط ہو کر رہ گئیں۔ انھوں نے کتنے ہی پرمسرت موقعوں پر گابی کو اپنے سالگرہ کے کیک کی بتیاں پھونک مار کر بجھاتے دیکھا تھا۔

روتھ کی دسویں سالگرہ سے ٹھیک ایک ہفتہ پہلے ہٹلر نے ''اعلیٰ جرمن نسل'' کے لیے

''رہنے کی گنجائش'' حاصل کرنے کی غرض سے، اپنے توسیع پسندانہ، سامراجی منصوبے کا آغاز کردیا۔ یکم ستمبر ۱۹۳۹ کو پولینڈ پر کیے جانے والے حملے نے ہٹلر کے ''بلٹز کریگ'' یا کڑکتی بجلی جیسی جنگ کے تصور کو واضح کردیا۔ جس وقت روتھ اپنی دسویں سالگرہ کی منتظر تھیں، بنی نوع انسان کی تاریخ کی عظیم ترین جنگ، دوسری عالمی جنگ، شروع ہوچکی تھی۔

۱۹۴۳ میں اتحادی فوجوں نے اپنے فضائی حملوں میں اضافہ کردیا اور شہری آبادیوں کو بھی نشانہ بنانے لگیں۔ کوئی رات ایسی نہ جاتی جب فضائی حملے کے سائرن کی آواز سے دہشت کے عالم میں ان کی آنکھ نہ کھلتی ہو اور خوف سے کانپتے ہوئے تہہ خانے میں جا کر پناہ نہ لینی پڑتی ہو۔

۴ دسمبر ۱۹۴۳ کی رات کو شدید بمباری ہوئی۔ روتھ کو پڑوسیوں کے بچوں کی چیخوں اور ان کے بڑوں کی دعاؤں کی آوازیں سنائی دیں۔ انھوں نے سوچا کہ وہ اس رات سے زندہ باہر نہ نکل پائیں گی۔ صبح کے وقت انھیں اپنے گھر والوں کو زندہ پا کر سخت تعجب ہوا۔ لیکن ان کے مکان کی پہلی منزل کو، جہاں روتھ کی خوابگاہ اور مطالعے کا کمرہ واقع تھا، بمباری سے سخت نقصان پہنچا تھا۔ اس کی چھت اڑ گئی تھی۔ دیواروں میں دراڑیں پڑ گئی تھیں اور فرش سے پانی رس رہا تھا۔ دروازے اکھڑ کر اپنی چوکھٹوں سے الگ ہو گئے تھے اور کھڑکیوں کے شیشے چکنا چور ہو چکے تھے۔ بجلی کی سپلائی منقطع ہو چکی تھی، پانی کے پائپ ٹوٹے پڑے تھے اور نکاس کا نظام تباہ ہو چکا تھا۔ ہر طرف گرد و غبار پھیلا تھا اور شیشوں کی کرچیاں بکھری ہوئی تھیں۔

روتھ کے والد والٹر فاؤ نے اپنے بیوی بچوں کو دیہات میں اپنی والدہ کے گھر لے جانے کا ارادہ کیا جو بمباری سے محفوظ رہا تھا۔ روتھ کی دو بڑی بہنیں والٹراڈ اور ریجینا اسلحے کی فیکٹری میں اپنی ڈیوٹی کر رہی تھیں اور تیسری آرمگارڈ اسکول کے کیمپ میں مشغول تھی،

اس لیے والدین نے روتھ اور ان کی چھوٹی بہن باربرا کو ساتھ لیا اور کچھ ضروری سامان لے کر روانہ ہو گئے۔ وہ جلتی ہوئی گلیوں میں سے ہو کر گزرے اور انھیں ملبے کے ڈھیروں پر چڑھ کر اور زمین پر پڑی لاشوں کو پھلانگ کر آگے بڑھنا پڑا۔ گرد و غبار اور دھواں ان کی آنکھوں کو اندھا کیے دے رہا تھا، جلی ہوئی لاشوں سے اٹھتے تعفن سے ان کی سانس بند ہوئی جا رہی تھی۔ وہ لوگ روتھ کی دادی اماں کے گھر شام کے وقت تھکن اور صدمے سے نڈھال پہنچے۔

لڑکیوں کو ان کی دادی کے پاس چھوڑ کر والدین لائپزگ واپس روانہ ہو گئے جہاں انھیں اپنے مکان کی دیکھ بھال کرنی تھی۔ لیکن سال بھر کے اندر گھر کے سب لوگ دوبارہ اکٹھے ہو گئے، کیونکہ لائپزگ شہر پہ بار بار ہونے والی بمباری کی خبریں سنتے ہوئے اپنے والدین سے دور رہنا روتھ اور باربرا دونوں بہنوں کے لیے بہت دشوار ثابت ہو رہا تھا۔

۳

باغ کا سبز دروازہ

جنگ کا خاتمہ ۸ مئی ۱۹۴۵ کو ہوا جب جرمن فوجوں نے اپنی شکست تسلیم کر کے غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دیے۔ روتھ کی عمر اب سولہ برس کی ہو چکی تھی۔ ان کا ملک چار اتحادی ملکوں کی فوج کے قبضے میں آ کر دو ٹکڑوں میں بٹ گیا تھا۔ اس ملک کے شہری ایک مخمصے سے دوچار تھے: ان کی شکست اور توہین کا لمحہ ہی ایک غیر انسانی آمریت سے ان کی نجات کا لمحہ بھی تھا، اور اس نجات کے باوجود وہ غیر ملکی فوجوں کے تسلط میں تھے۔

بہار کا موسم تھا اور روتھ کے باغ میں چیری کے پیڑ پھولوں سے لدے ہوئے تھے۔ ملبے کے ڈھیروں کے درمیان گلاب کے پھول اپنی عالی شان بہار دکھا رہے تھے۔ روتھ اپنے باغ کے سبز دروازے پر بیٹھی برابر کے مکان کی گری ہوئی دیوار کو تک رہی تھیں۔ جرمنی کے بہت سے اور شہروں کی طرح ان کا شہر بھی تباہی کا منظر پیش کر رہا تھا۔ اس جنگ کے نتیجے میں جرمنی کے تیس لاکھ سے زیادہ لوگ ہلاک ہوئے تھے۔ وہاں بیٹھے بیٹھے روتھ کے ذہن میں خیال آ رہا تھا کہ ان کی جان بھلا کیسے بچ گئی۔ ان کی نظروں کے سامنے سڑک پر امریکی فوجی بے پروائی سے چلتے ہوئے مسکرا رہے تھے، ہاتھ ہلا رہے تھے اور بچوں میں

چاکلیٹ تقسیم کر رہے تھے۔ ان کی موجودگی وقتی تسکین کا باعث تھی لیکن بہت جلد ان کی جگہ روسی فوجیوں نے لے لی۔ جب ان کی طرف سے ریپ اور لوٹ مار کی خبریں آتیں تو روتھ اور باربرا کو عدم تحفظ کا شدید احساس ہوتا۔

پھر کھانے پینے کی اور دوسری چیزوں کی سخت قلت شروع ہوگئی۔ ۱۹۴۶ کے سخت جاڑوں میں روزمرہ راشن اور بھی کم کر دیا گیا۔ ان کے حصے میں صرف چقندر اور آلو آتے۔ وہ انھیں ابالتے، تلتے اور ان کا بھرتا بناتے۔ ان کے نومولود بھائی کے لیے دودھ دستیاب نہ تھا۔ ان کی ماں اتنی بیمار تھیں کہ اسے اپنا دودھ نہیں پلا سکتی تھیں۔ روتھ کو باہر نکل کر لکڑیاں یا کوئلے چرا کر لانے پڑتے تاکہ انھیں جلا کر گھر کو گرم رکھا جا سکے۔ نومولود بچہ کچھ ہی عرصے میں چل بسا۔

۱۹۴۶ میں سرد جنگ کے آغاز ہی سے جرمنی دونوں بڑی طاقتوں امریکہ اور سوویت یونین کے درمیان نظریاتی جنگ کا میدان بن گیا۔ یورپ کا جو خطہ سوویت یونین کے زیرِ اثر تھا اس کی سرحدوں کے گرد ایک آہنی پردہ کھنچ گیا جس کے اندر سیاسی ڈھانچے پر کمیونسٹوں کا تسلط قائم ہو گیا جنھوں نے بینکوں اور صنعتوں کو قومی ملکیت میں لے لیا۔ والٹر فاؤ کی اشاعتی فرم کو بھی قومیا لیا گیا۔ ان کی ملازمت ختم ہوگئی۔ چونکہ وہ کمیونسٹ پارٹی کے رکن نہ تھے، اس لیے ان کی بیٹیوں کے لیے یونیورسٹی میں داخلہ لینا ناممکن ہو گیا۔ سخت مایوسی کے عالم میں وہ سرحد پار کر کے مغربی جرمنی چلے آئے اور وہاں وائزبادن کے شہر میں اپنے سابق باس سے آملے تاکہ اشاعتی کاروبار کو نئے سرے سے قائم کرنے میں ان کی مدد کر سکیں۔

مغربی اتحادیوں نے مغربی جرمنی میں پارلیمانی جمہوریت قائم کی۔ امریکہ کے معاشی امداد کے پروگرام، ''دی ماسٹر پلان'' کی مدد سے اور جون ۱۹۴۸ میں کی گئی کرنسی کی اصلاحات کے نتیجے میں مغربی جرمنی کی معیشت بحال ہوئی۔ تعمیرِ نو کی سرگرمیوں کا زبردست

پھیلاؤ ہوا۔ اس ''معاشی معجزے'' کے نتیجے میں وہ سماجی مسائل بھی رفتہ رفتہ حل ہوئے جو نیشنل سوشلسٹ آمریت اور جنگ کے دور میں پیدا ہوئے تھے۔ جنگ میں زخمی ہونے والوں کا علاج کیا گیا، ان کو معاوضوں کی فوری ادائیگی کی گئی، ہجرت کر کے آنے والوں کو معاشرے میں سمویا گیا اور رہائش کے سنگین مسئلے کو حل کیا گیا۔

ان بہتر ہوتے ہوئے حالات سے حوصلہ پا کر محبت کرنے والے باپ کے طور پر والٹر فاؤ نے اپنی بیٹی روتھ کو بھی وائزبادن میں ان سے آ ملنے کو کہا۔ لیکن سرحد پر روسی فوجیوں کا پہرہ تھا جو چوری چھپے سرحد پار کرنے والوں کو دیکھتے ہی گولی مار دیتے تھے۔ اس کے باوجود روتھ وہاں سے نکلنے کے لیے پُرعزم تھیں۔

انھوں نے اپنا ٹیڈی بیئر اور تھوڑا سا ذاتی سامان ساتھ لیا اور یہ سوچے بغیر نکل کھڑی ہوئیں کہ انھیں کس سمت میں جانا ہے۔ پہلے وہ ٹرین کے ذریعے مشرقی جرمنی کی سرحد تک گئیں، پھر خفیہ طور پر سرحد پار کر کے ''نومینز لینڈ'' میں پہنچ گئیں جو مشرق اور مغرب کے درمیان واقع تھا۔ وہ اس علاقے میں دو دن اور دو رات متواتر پیدل سفر کرتی رہیں؛ اس دوران وہ دن کے وقت جنگلوں اور کھیتوں سے گزرتیں، وادیاں اور درے پار کرتیں اور رات آتی تو چھوٹے چھوٹے دیہات کے پاس واقع اناج ذخیرہ کرنے کے احاطوں کے پیچھے چھپ جاتیں۔ ایک بار فر کی جھاڑیوں سے لدی ایک ڈھلان سے اترتے ہوئے ان پر دو فوجیوں کی نظر پڑ گئی۔ ان میں سے ایک روسی اور دوسرا جرمن تھا۔ روسی فوجی غالباً اتنا تھکا ہوا تھا کہ کوئی اقدام نہ کر سکتا تھا لیکن جرمن فوجی نے اس نوعمر تارکِ وطن کو حراست میں لے لیا۔ اس نے روسی فوجی سے کہا کہ وہ اس لڑکی کو حراستی کیمپ میں داخل کرا کے واپس آئے گا، اور روتھ کو وہاں سے چند قدم آگے لے آیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے ایک سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا، ''مغرب اُس طرف ہے۔''

روتھ اتنی خوش ہوئیں کہ اس کا شکریہ ادا کرنا بھی بھول گئیں۔ سرحد پار کر کے دوسری طرف پہنچنے کے بعد انھوں نے مڑ کر پیچھے نظر ڈالی تو دیکھا کہ جرمن فوجی اب بھی وہیں کھڑا ان کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلا رہا ہے۔ انھوں نے جواب میں مسکرا کر ہاتھ ہلایا اور پھر تیز قدموں سے آگے بڑھ گئیں۔ گوسلر نامی قصبے میں اپنے چچا کے گھر پہنچنے تک وہ تھکن سے اتنی بے حال ہو چکی تھیں کہ بستر پر ڈھیر ہو گئیں۔

چند روز آرام کرنے کے بعد وہ کولون شہر میں اپنے والد سے ملیں جہاں وہ ایک کتاب میلے میں شرکت کے لیے آئے ہوئے تھے۔ وہ دونوں ایک اعلیٰ درجے کے ہوٹل میں ٹھہرے اور ایک دوسرے کی معیت میں پر لطف وقت گزارا۔ روتھ کو اپنی نئی نئی ملی ہوئی آزادی ایک بڑی نعمت معلوم ہو رہی تھی اور وہ اس کے ایک ایک لمحے سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ کچھ ہی عرصے میں دونوں باپ بیٹی نے باقی گھر والوں کو بھی غیر قانونی طور پر وائزبادن بلوا لیا۔

۲۳ مئی ۱۹۴۹ کو وفاقی جمہوریہ جرمنی کا بنیادی قانون منظور کیا گیا جس میں اس بات کو تسلیم کیا گیا کہ ملک کے شہریوں کی اکثریت دستوری نظام، پارلیمانی جمہوریت، سماجی فلاحی ریاست اور وفاقی ریاستی ڈھانچے کے حق میں ہے۔ اس بنیادی قانون نے وفاقی جمہوریہ جرمنی میں ایک پائیدار جمہوریت کے قیام کے لیے ٹھوس بنیاد فراہم کی۔ اس کی پہلی شق، جس کا تعلق بنیادی حقوق سے تھا، ریاست پر ذمہ داری عائد کرتی تھی کہ وہ ہر فرد کے انسانی وقار اور انسانی حقوق کا احترام کرے۔

۲۳ مئی ۱۹۴۹ ہی وہ تاریخ تھی جب وفاقی جمہوریہ جرمنی باقاعدہ طور پر قائم ہوئی۔ اسی سال ۷ اکتوبر کو مشرقی جرمنی یا جرمن ڈیموکریٹک ریپبلک بھی وجود میں آئی۔ اس طرح جرمنی کی تقسیم کا عمل مکمل ہو گیا۔ روتھ کے لیے اس کا مطلب یہ تھا کہ اب وہ اپنی پیار کرنے

والی دادی اور پھوپھی سے کبھی نہیں مل سکیں گی جنھوں نے جنگ کے برسوں میں ان کی اور ان کی چھوٹی بہن باربرا کی اتنی اچھی طرح دیکھ بھال کی تھی۔ بیشتر جرمن باشندوں کی طرح روتھ کے لیے بھی تقسیم کی اس کڑوی گولی کو نگلنا بے حد دشوار تھا۔

۵ ستمبر ۱۹۴۹ کو کونراڈ ایڈیناور کو — صرف ایک ووٹ کی اکثریت سے — وفاقی جمہوریۂ جرمنی کا وفاقی چانسلر منتخب کیا گیا۔ اس کے بعد غیر معمولی معاشی ترقی اور خوشحالی کا ایک دور شروع ہوا جو پندرہ سال سے زیادہ عرصے تک جاری رہا۔ وفاقی جمہوریہ معاشی انہدام کی حالت سے اٹھ کر دنیا کی تیسری مضبوط ترین صنعتی معیشت کے مقام تک جا پہنچی۔

۱۹۵۰ کی دہائی میں ''معاشی معجزے'' ہی کا دور تھا جس کے دوران روتھ محبت میں مبتلا ہوئیں۔

۴

مجھ سے پہلی سی محبت . . .

روتھ کو اپنے اشاعتی کاروبار میں شامل کرنے کی ان کے والد کی کوششیں ناکام ہو چکی تھیں۔ کاروبار ایسی چیز نہ تھی جس سے وہ دلچسپی لے سکتیں۔ عورتوں کے مقبول عام فیشن میگزین ''بیئر'' (Beyer) پر، جس کی تقسیم کاری کا کام ان کے والد اس قدر ذوق و شوق سے کرتے تھے، روتھ مشکل ہی سے کبھی نظر ڈالتیں۔ نمونیا کے ہاتھوں اپنے کمسن بھائی کی موت اور زخمی سپاہیوں اور بے گھر پناہ گزینوں کی مدد کرنے کے تجربے نے روتھ میں طب کی تعلیم کے لیے دلچسپی پیدا کر دی۔ ایک نوعمر لڑکی کے طور پر وہ جنگ کے بعد لائپزگ میں بوڑھے اور بیمار شہریوں کی دیکھ بھال کر چکی تھیں۔ وہ ہمیشہ سے ایک ذہین طالب علم رہی تھیں چنانچہ انھیں مینز یونیورسٹی کے کلیۂ طب میں داخلہ حاصل کرنے میں کوئی مشکل پیش نہ آئی۔

یہ وہی شہر تھا جس میں پرنٹنگ پریس کو متعارف کرنے والے یوہانس گٹن برگ (۱۴۰۰۔۱۴۶۸) نے جنم لیا تھا۔ گٹن برگ نے مینز شہر ہی سے ۱۴۵۵ میں اپنی مشہور ۴۲ سطری بائبل شائع کی تھی۔

یورپ کے ثقافتی قلب میں، دریائے رائن کے کنارے واقع اسی مینز شہر میں طلبا کے ایک رقص کے پروگرام کے موقعے پر روتھ کی ملاقات ہرمن سے ہوئی۔ ہرمن دراز قد اور خوبصورت تھا اور رقص کرنے میں خاص مہارت رکھتا تھا۔ اس رات ہرمن کے ساتھ رقص کرنے میں روتھ کو بہت لطف آیا۔ اگلی صبح بہت سویرے اٹھ کر وہ اپنے ہاسٹل کے پچھواڑے کے باغ میں گئیں تاکہ گیندے کے زرد نارنجی پھولوں کی رفاقت میں وقت گزار سکیں جن سے انھیں بہت لگاؤ محسوس ہوتا تھا۔ جونہی انھوں نے پھولوں پر سے نگاہ اٹھائی، ہرمن کو اپنے سامنے کچھ فاصلے پر کھڑا پایا۔ اس نوجوان کے حسین سیاہ بال صبح کی نرم ہوا میں ہولے ہولے لہرا رہے تھے، اس کی گہری بھوری آنکھیں روتھ کو ستائش کی نظروں سے تک رہی تھیں۔ ہرمن نے پاس آکر روتھ کو بتایا کہ وہ پچھلی پوری رات سو نہیں سکا۔ وہ رقص گاہ کے فرش پر روتھ کی موجودگی سے مسحور ہو کر رہ گیا تھا۔ صاف نیلے آسمان کے نیچے کھڑی روتھ کو محبت کے اس اظہار نے اپنے قدموں سے اٹھا کر ہوا میں بلند کر دیا۔ اور اگلے چھ مہینوں تک ان کے قدم واپس زمین پر نہ آئے۔

رائن کے کنارے واقع انگور اُگانے والے حسین خطے میں روتھ اور ہرمن کا رومانس پروان چڑھتا گیا اور پورے کیمپس میں گفتگو کا موضوع بن گیا۔ جب وہ دونوں ساتھ ساتھ سائیکلیں چلاتے تو لڑکیاں روتھ پر رشک کرتیں اور لڑکے افسوس میں ہاتھ ملا کرتے۔ وہ دونوں ایک یہودی قبرستان میں درختوں کے سائے تلے ایک دوسرے کو بانہوں میں سمیٹے، ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گھنٹوں گزار دیا کرتے۔

ہرمن کا ساتھ پا کر روتھ کو اپنی زندگی میں پہلی بار احساس ہوا کہ کسی اور کے لیے جینا کیا معنی رکھتا ہے۔ اس وقت تک روتھ کے ذہن پر خود اپنے ہی وجود، اپنی ہی ذات کا خیال غالب رہا تھا۔ ہرمن کی محبت نے انھیں بتایا کہ دوسروں کے لیے قربانی دینے میں کتنی

مسرت پنہاں ہے۔

ایک روز صبح سویرے ہرمن دوڑتا ہوا روتھ کے ہاسٹل کے کمرے میں پہنچا۔ روتھ نے دروازہ کھولا تو اسے اپنے سامنے، ہاتھ میں ایک چوہےدان لیے کھڑا پایا جس میں ایک چوہا بند تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ دونوں اس چوہے کو آزاد کرنے کی خوشی کا ساتھ ساتھ تجربہ کریں۔ روتھ کو یہ بات بڑی پرکشش معلوم ہوئی۔ لیکن یہ کشش جلد ہی ماند پڑ گئی۔ زندگی میں چوہوں کو پکڑنے اور چھوڑنے کے کھیل سے بڑھ کر بھی بہت کچھ تھا۔ ہرمن روتھ کی بے چین روح کی گہرائیوں کو نہ پہنچ سکا۔

انھی دنوں روتھ نے فرینکفرٹ میں طلبا کی ایک میٹنگ میں شرکت کی جس میں ایک معمر ولندیزی خاتون کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ وہ ایک کنسنٹریشن کیمپ میں قید رہ چکی تھیں لیکن محبت اور درگزر کا پرچار کر رہی تھیں۔ روتھ ان کی باتیں سن کر سحر زدہ رہ گئیں۔ کوئی شخص اتنی اذیت سے گزارے جانے کے بعد بھی عفو و درگزر کا سبق دے سکتا ہے! وہ ہمت کر کے خاتون کے پاس پہنچیں اور ان سے سوال کیا، ”مسیحی بننے کے لیے کیا کرنا پڑتا ہے؟“

”عبادت“، انھیں مختصر جواب ملا۔ لیکن روتھ کو تو خدا کے وجود پر بھی پوری طرح یقین نہ تھا، پھر وہ اس کی عبادت کیونکر کر سکتی تھیں۔

روتھ کی پرورش ایک ملحدانہ ماحول میں ہوئی تھی جہاں ہر شخص دوسرے کو دیکھتے ہی ”ہیل ہٹلر!“ کہنے پر مجبور تھا۔ جنگ کی لائی ہوئی تباہی اور ہلاکت نے اعتقاد کی بنیادوں کو بری طرح ہلا دیا تھا۔ زندگی پر اعتبار قائم نہ رہا تھا۔ جنگ ختم ہونے کے بعد سے ایک ہی سوال روتھ کے ذہن پر مسلط رہا تھا: ”میں آخر زندہ کیوں بچ گئی؟“

اس سوال کے جواب کی جستجو میں روتھ نے کلیۂ فلسفہ و کلاسیکی ادب میں برپا کیے جانے والے دانشورانہ مباحثوں میں شرکت شروع کر دی۔ وہاں ان کی ملاقات رولینڈ سے

ہوئی۔ روتھ کے برخلاف، جن کے والدین پروٹسٹنٹ عقیدے سے تعلق رکھتے تھے، رولینڈ ایک کیتھولک خاندان کا فرد تھا۔ رولینڈ کے کیتھولک اخلاقی عقائد نے اثر پذیر روتھ کے ذہن پر گہرا اثر ڈالا۔ روتھ کو اس بات نے بے حد متاثر کیا کہ رولینڈ اپنی چھوٹی چھوٹی کمزوریوں کا بڑے وقار سے اعتراف کرتا تھا اور پھر بڑی محنت سے ان پر قابو پانے کی کوشش کرتا تھا۔ ان دونوں کی صبح کی سیر عموماً عظیم امپیریل کیتھیڈرل کے دروازے پر ختم ہوتی۔ رولینڈ عبادت کے لیے اندر چلا جاتا اور روتھ باہر کھڑی کلیسا کی تعمیراتی خوبیوں کا جائزہ لیتی رہتیں۔ ان دونوں نے طلبا کے ایک کنونشن میں نمائندوں کے طور پر شرکت کرنے کے لیے ساتھ ساتھ پیرس کا سفر بھی کیا۔

لیکن زندگی اب بھی معنی سے محروم تھی۔ سارتر کا ہر شے کی بے معنویت کا نظریہ درست معلوم ہوتا تھا — کہ کسی بھی چیز کا کوئی حقیقی وجود نہیں ہے۔ رولینڈ کے ساتھ اپنے تعلق کے کسی ناخوشگوار انجام سے خود کو بچانے کے لیے روتھ پری کلینکل امتحان دینے کے بعد مینز سے ماربرگ شہر منتقل ہو گئیں۔

ماربرگ کے یونیورسٹی ٹاؤن میں روتھ نے اپنی طب کی تعلیم جاری رکھی اور ساتھ ہی ساتھ طلبا کے کیتھولک پیرش میں شمولیت بھی اختیار کر لی۔ حقیقت کی تلاش جاری رکھتے ہوئے، روتھ زندگی، محبت اور موت کے بارے میں جستجو اور بحث مباحثے کے عمل سے گزرتی رہیں۔ وہ اکثر ایک اہل علم جیسوئٹ پادری فادر کوچ کے پاس جایا کرتیں جنھوں نے بعد میں ان کو بتایا، ''میں نے بارہا تمھیں بتانا چاہا کہ مجھے دوسرے کام بھی ہیں، لیکن تمھاری علم کی لگن نے مجھے یہ بات کہنے سے باز رکھا۔'' وہ کتابیں پڑھا کرتیں اور رومانو گارڈینس کی کتاب ''دی لارڈ'' سے بے حد متاثر ہوئیں۔

ماربرگ میں روتھ کی ملاقات گوئنتھر سے ہوئی جو اسی یونیورسٹی میں فلسفے اور کلاسیکی

ادب کا طالب علم تھا۔ انھیں ایک دوسرے کو رسمی انداز میں ''آپ'' سے ''تم'' کے بے تکلفانہ تخاطب تک پہنچنے میں کئی مہینے لگے۔ لیکن جب ان کی دوستی مستحکم ہوگئی تو وہ جلد ہی ایک دوسرے کو بہت گہرائی میں جاننے لگے۔ ان کی دوستی روتھ کی داخلی سکون کی جستجو کے متوازی چلتی تھی۔ وہ دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے دل نشیں مناظر کے درمیان گھوما کرتے، دو ساتھی مسافروں کی طرح جو ایک مشترکہ سچ کی تلاش میں ہوں۔

ایک ستاروں بھری رات کو، جب وہ دونوں ساتھ ساتھ ماربرگ کے عالیشان لینڈ گریوز کاسل کی دیوار پر بیٹھے خاموشی سے نیچے اندھیری وادی کو تک رہے تھے، گوئنتھر نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا، ''ہمیں یا تو خودکشی کر لینی چاہیے یا کیتھولک ہو جانا چاہیے۔'' اس نے ان دونوں کے لیے فیصلہ کر دیا تھا۔ لیکن جس وقت وہ شادی شدہ زندگی ساتھ ساتھ گزارنے کی غرض سے روتھ کی جانب دیکھ رہا تھا، روتھ کی آنکھیں ان دنیاوی بندھنوں سے آگے دیکھنے لگی تھیں۔ کیونکہ روتھ نے کبھی کسی راستے کو آخر تک پہنچنے سے پہلے ترک نہیں کیا تھا۔ اگر انھیں کیتھولک بننا تھا تو انھیں ایک آرڈر میں شامل ہو کر ایک نن کی زندگی اختیار کرنی ہی تھی۔

لیکن یہ فیصلہ کرنا اتنا آسان نہ تھا۔ انھیں گوئنتھر سے بہتر رفیقِ حیات نہیں مل سکتا تھا۔ اس کی محبت بڑی نرم خو تھی اور وہ انھیں بہت گہرائی سے سمجھتا اور ان کا خیال رکھتا تھا۔ ان دونوں کی دوستی روتھ کی اندرونی کشمکش کے باوجود کئی سال جاری رہی۔ اس وقت تک روتھ بورڈ کا امتحان پاس کر کے ایک اسپتال سے انٹرن کے طور پر وابستہ ہو چکی تھیں۔ گوئنتھر اکثر ماربرگ کے یونیورسٹی ٹاؤن سے ٹرین میں سوار ہو کر ساورلینڈ کی فر سے لدی پہاڑیوں پر واقع دلکش مناظر والے وِنٹربرگ ان سے ملنے آتا۔ وہ شاہ بلوط کے درختوں کی قطاروں والے جنگلوں میں گھومتے اور راستے میں ڈیزی کے پھول چنتے چلتے۔

ایک ویک اینڈ پر ملنے کے لیے ماربرگ آنے کی باری روتھ کی تھی۔ گوئنتھر انھیں لینے اسٹیشن پر آیا۔ شام انھوں نے اکٹھے گزاری۔ تب وہ لمحہ آیا جس کا وہ بڑے اشتیاق سے انتظار کرتی رہی تھیں۔ گوئنتھر نے ان سے شادی کی درخواست کی۔ روتھ نے، جو اس سوال کا جواب ''ہاں'' میں دینے کی منتظر تھیں، خود کو جواب میں معذرت کرتے ہوئے پایا، ''مجھے افسوس ہے گوئنتھر، لیکن میں ہاں نہیں کہہ سکتی۔ میری زندگی کسی اور مقصد کے لیے وقف ہے۔''

انھوں نے اپنی اندرونی جنگ جیت لی تھی، اور اس پر گوئنتھر سخت صدمے کی حالت میں رہ گیا۔ لیکن کسی نہ کسی طور اسے اس پورے عرصے اس کا علم رہا تھا، جیسا کہ اس نے روتھ کو بعد میں بڑے بھاری دل کے ساتھ بتایا۔ ''ہمارے انتہائی قرب کے لمحات میں بھی، مجھے اپنے اور تمھارے درمیان ایک کانچ کی دیوار محسوس ہوتی تھی۔ اگر تم نے بتایا ہوتا کہ تمھارے انکار کی وجہ کوئی اور مرد ہے تو میں اس سے اچھی طرح نمٹ لیتا۔ لیکن اب جبکہ تم نے مجھے بتایا ہے کہ تم نے مجھے خداوند کی محبت کے لیے ترک کیا ہے تو پھر کوئی اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہے۔''

وہ دونوں رات کی تاریکی میں خاموشی سے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے جنگل سے گزرتے رہے یہاں تک کہ دن نکل آیا۔ یہ جدا ہونے کا لمحہ تھا۔ اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر اسٹیم انجن کی سیٹی بجی۔ انھیں ایک دوسرے کی آنکھوں میں چھائی دھند بمشکل دکھائی دے رہی تھی۔

روتھ ونٹر برگ واپس جا کر اسپتال کے مصروف شب و روز میں گم ہو گئیں جہاں وہ ایمرجنسی کے آپریشن اور نازک زچگیوں کی دیکھ بھال کیا کرتی تھیں۔ ان مصروفیات کے درمیان وہ نن کے طور پر کسی کیتھولک آرڈر میں شامل ہونے کے امکانات کے بارے میں

تبادلۂ خیال کے لیے وقت نکال لیتی تھیں۔ ان کے والد کو ان کا فیصلہ منظور نہ تھا۔ لیکن ان کی والدہ سادگی سے سوچتی تھیں، ''اگر اس کی داخلی طلب یہی ہے تو اسے اسی پر عمل کرنا چاہیے۔'' اس وقت تک روتھ کی سب بڑی بہنوں کی شادیاں ہو چکی تھیں اور وہ کام بھی کرنے لگی تھیں۔ سب سے بڑی بہن والٹراڈ استانی تھی، اس سے چھوٹی ریجینا ایک لائبریری میں کام کرتی تھی اور آرمگارڈ، جو روتھ سے دو سال بڑی تھی، قانون کی ڈگری حاصل کر چکی تھی۔ سب سے چھوٹی بہن باربرا، جس نے ایک لیبارٹری اسسٹنٹ کے طور پر تربیت پائی تھی، ایک اعصابی مرض میں مبتلا تھی۔ چونکہ اس کی دیکھ بھال کے لیے والدین اور دوسری بہنیں موجود تھیں، اس نے خود ہی روتھ کے فیصلے کی تائید کر دی تھی۔ اور آخر کار وہ دن آ پہنچا جب روتھ کو پیرس میں ''ڈاٹرز آف دی ہارٹ آف میری'' کی کمیونٹی میں شامل ہونا تھا۔

۵

پیرس سے کراچی

پیرس کے لوور میوزیم میں لیونارڈو داونچی کی ''مونا لیزا'' اپنے سامنے کھڑی روتھ پر مسکرا رہی تھی۔ روتھ نے نوتر دام کیتھیڈرل کے نفیس تعمیری حسن کو بھی سراہا جہاں نپولین بوناپارٹ نے ۱۸۰۴ میں فرانس کے بادشاہ کے طور پر اپنی تاجپوشی کی رسم ادا کرائی تھی، اور ساں شاپیل کے گرجا گھر کی رنگین شیشوں والی دیواروں کو بھی جن کے اندر کانٹوں کا وہ تاج محفوظ تھا جو یسوع مسیح کو پہنایا گیا تھا۔

کانونٹ کے اندر روتھ کی ملاقات جاپان، ہندوستان، ایتھوپیا اور برازیل سے آئی ہوئی شاگرداؤں سے ہوئی جن سے انھوں نے دنیا کی دوسری ثقافتوں کے بارے میں جانا لیکن جاننے کا یہ عمل کچھ زیادہ سہل نہ تھا۔ اپنے ابتدائی دنوں میں سے ایک دن روتھ غسلخانے سے پورے کپڑے پہنے بغیر باہر نکل آئیں۔ ان کے اس عمل نے ہندوستان سے آئی ہوئی سسٹرز کو پریشان کر دیا۔ اس واقعے کی اطلاع بیلجیئن سپیریر کو پہنچائی گئی۔ اس نرم خو خاتون نے روتھ کو اپنے پاس بلا کر سمجھایا کہ ایک چیز جو کسی ایک ثقافت میں معمول کی بات سمجھی جاتی ہے، کسی دوسری ثقافت میں انتہائی ناقابلِ قبول ہو سکتی ہے۔ لیکن جرمن روتھ

کی ہندوستانی سسٹرز سے جلد ہی دوستی ہوگئی جب ایک ہندوستانی شاگردہ کو پہلی بار شیزوفرینیا کا دورہ پڑا۔ اس موقعے پر جب باقی سب شاگردائیں گنگ کھڑی تھیں کیونکہ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کیا جائے، روتھ نے آگے بڑھ کر انھیں سمجھایا کہ یہ ایک نفسیاتی بیماری ہے جس کی شدت کو دوا کے ذریعے قابو میں لایا جاسکتا ہے۔ ان کی تجویز کردہ باربیتیورک کی دوا سے مریض لڑکی کو واقعی فائدہ ہوا اور کانونٹ میں ہر ایک نے سکون کا سانس لیا۔

جلد ہی کانونٹ میں موجود ہندوستانی کمیونٹی کی طرف سے درخواستوں کا تانتا بندھ گیا کہ روتھ ہندوستان آکر لوگوں کی خدمت کریں۔ وہ خود واپس اپنے وطن مشرقی جرمنی جانا چاہتی تھیں جو اب جرمن ڈیموکریٹک ریپبلک بن چکا تھا، لیکن بیلجین سپیریر نے انھیں مشورہ دیا کہ انھیں ایک کمیونسٹ ملک میں لوٹنے کا خطرہ مول لینے کے بجائے ہندوستان جانے کے امکان پر غور کرنا چاہیے۔ روتھ نے ایشیا کے غریبوں کی حالت زار کے بارے میں پڑھ رکھا تھا۔ انھوں نے ہندوستانی ویزا کی درخواست دے دی۔ اس دوران انھوں نے بون کے ایک اسپتال کے زچگی اور نسوانی علاج کے یونٹ میں اپنی ایک سال کی تربیت بھی مکمل کر لی۔ اسی عرصے میں ان کے والد بیمار پڑ گئے اور انھیں ایک اسپتال میں داخل کروانا پڑا۔ روتھ چھٹی لے کر ان کی تیمارداری کے لیے چلی گئیں۔ لیکن وہ کچھ ہی عرصے میں چل بسے اور روتھ ان کی تدفین میں شرکت کے بعد پیرس لوٹ آئیں۔ مگر ہندوستانی ویزا کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔ تب کسی نے مشورہ دیا کہ انھیں کراچی (پاکستان) چلے جانا چاہیے جہاں سے ہندوستان پہنچنا نسبتاً آسان ہوگا۔

جنگ کے بعد کے لائپزگ میں اٹھارہ سالہ روتھ اپنے آس پاس کی زندگی میں اتنی مگن تھیں کہ انھیں خبر تک نہ ہوئی تھی کہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ کو اسلامی جمہوریہ پاکستان دنیا کے نقشے پر ابھر آیا ہے۔ اس کے مغربی اور مشرقی حصے کے درمیان وسیع ہندوستانی علاقہ

حائل تھا۔ ملک کی یہ عجیب و غریب ساخت برصغیر کے مسلمانوں کے علیحدہ وطن کے مطالبے پر ملک کی تقسیم کا نتیجہ تھی۔ اس حسابی کارنامے کو انجام دینے کے بعد برطانوی مہم جو رخصت ہو گئے اور دونوں نوزائیدہ ملکوں کو ایک دوسرے سے مستقل طور پر نبرد آزما چھوڑ گئے۔

جس وقت روتھ نے کراچی کے کیتھولک کانگریگیشن کی رکن اور میکسیکو کی رہنے والی فارماسسٹ برنیس وارگاس کی درخواست قبول کی، تب تک پاکستان اپنی شیر خوارگی کے پرآشوب دور سے نکل آیا تھا اور ایک نوعمر ملک بن چکا تھا۔

یہ ملک اپنے بچپن ہی میں اپنے باپ قائداعظم محمد علی جناح کی وفات کے باعث یتیم ہو چکا تھا۔ قائداعظم کی وفات ٹی بی جیسی مہلک بیماری سے ہوئی جسے ستمبر ۱۹۴۸ تک مخفی رکھا گیا۔ انھی کی انتھک قیادت میں آل انڈیا مسلم لیگ نے پاکستان کے قیام کی جدوجہد کی تھی۔ ان کی المناک وفات کے چار برس کے اندر اندر ملک کے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خاں کو راولپنڈی میں ایک عام جلسے کے دوران گولی مار کر قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے کئی غیر مقبول حکومتیں اقتدار میں آئیں۔ ملک کے دونوں حصوں کے درمیان معاشی، سیاسی اور سماجی اختلافات کے نتیجے میں کھنچاؤ بڑھتا گیا۔ ہندوستان کے ساتھ کشمیر کے تنازعے کے باعث دونوں ملکوں کو سماجی شعبوں سے کہیں زیادہ اپنی دفاعی صلاحیت کی تعمیر پر خرچ کرنا پڑا۔ ۱۹۵۰ کے عشرے کے آخر تک پاکستان ایک غیر ترقی یافتہ زرعی معیشت، انتہائی پست شرح خواندگی، اور شیر خوارگی کی عمر میں بچوں اور زچگی میں ماؤں کی موت کی اونچی شرح جیسے مسائل کا سامنا کر رہا تھا۔ اس کے بیشتر شہری دور افتادہ دیہات میں رہتے تھے جہاں صاف پانی اور نکاس جیسی بنیادی سہولتوں تک کا فقدان تھا۔ کراچی، جو ملک کا سب سے بڑا شہر تھا، اور بڑی بندرگاہ اور دارالحکومت بھی تھا، ان دسیوں لاکھ مہاجروں کو بسانے کے گمبھیر مسئلے سے دوچار تھا جو تقسیم کے وقت سرحد پار سے آئے تھے۔

جس وقت روتھ یورپ سے پاکستان کے لیے روانہ ہوئیں، مغربی جرمنی اپنے چانسلر کونراڈ ایڈیناور کی قیادت میں ''اقتصادی معجزے'' کے نور میں نہایا ہوا تھا۔ فرانس، صدر چارلس ڈیگال کی سربراہی میں، اپنی معاشی اور سیاسی طاقت بحال کر رہا تھا۔ پاکستان نے کانونٹ کی اس شاگردہ کے استقبال کی تیاری یوں کی کہ اکتوبر ۱۹۵۸ میں جنرل ایوب خاں نے صدر کا عہدہ سنبھال لیا۔ دراز قد اور بارعب شخصیت کے مالک ایوب خاں نے ملک کے دارالحکومت کو ساحلِ سمندر پر واقع کراچی سے مارگلہ کی پہاڑیوں کے دامن میں واقع اسلام آباد منتقل کرنے کا فیصلہ کیا اور معاشی اور سماجی اصلاحات کا پروگرام شروع کیا جس کے تحت ملک کو پہلی بار کسی قدر استحکام نصیب ہوا۔

جب روتھ نے اپنی والدہ کو بتایا کہ وہ پاکستان جا رہی ہیں تو انھیں فکر لاحق ہو گئی۔ انھوں نے خواب دیکھا کہ ان کی بیٹی ایک لفٹ میں سوار اوپر کی طرف جا رہی ہے۔ لفٹ کو دو رسّیاں اوپر کھینچ رہی ہیں جن میں سے ایک مضبوط ہے اور دوسری کمزور، جو بس ٹوٹنے ہی والی ہے۔ ماں کے دل میں کمزور رسّی کو دیکھ کر زور کا ہول اٹھتا ہے لیکن تب ہی ان کا دھیان مضبوط رسّی کی طرف جاتا ہے اور وہ خود سے کہتی ہیں، ''پھر بھلا کیا ڈرنا!''

۶

اُس بے وفا کے شہر میں

نسیم بیگم ۱۹۶۰ کے عشرے میں پاکستان کی مقبول گلوکارہ تھیں۔ انھوں نے نامور شاعر منیر نیازی کی غزل گائی:

اُس بے وفا کا شہر ہے اور ہم ہیں دوستو

اشکِ رواں کی لہر ہے اور ہم ہیں دوستو

اداکارہ مسرت نذیر اپنی خوابناک آنکھوں کو گلیسرین کے آنسوؤں سے نم کیے، جھلملاتی شمعوں کی روشنی میں نسیم بیگم کے اداس نغموں کی دھن میں کراچی کے سینما گھروں کے بلیک اینڈ وائٹ اسکرینوں پر ڈولتی پھر رہی تھیں۔

ایک اجنبی شہر کی ایک نیم تاریک جھونپڑی میں ایک نابینا ''کوڑھی'' کے چہرے پر جھکی روتھ فاؤ اس کی متعفن اور بگڑی ہوئی ناک میں سے گوشت کھانے والے کیڑے ایک چمٹی کی مدد سے چن رہی ہیں۔ پھر ایک اور مریض کی باری آتی ہے جس کے بدوضع ہاتھوں پر جلنے کے زخم ہیں، کیونکہ اس کے ہاتھوں کی درد یا جلن محسوس کرنے کی صلاحیت جذام کی بیماری کے باعث ختم ہو چکی ہے اور اس کے بدن کی تمام گرد اور غلاظت دھو کر اسے صاف

کپڑے پہنائے جاتے ہیں۔ ایک اور بیمار وہاں لیٹا اپنے سوجے ہوئے پاؤں کے پیپ پڑے زخموں کی تکلیف سے کراہ رہا ہے جن سے اٹھتی عفونت اور ان پر بھنکتی مکھیوں نے پورے کمرے کو ناقابلِ برداشت بدبو سے بھر دیا ہے۔ روتھ یہاں نادار ترین غریبوں اور گداگروں کے درمیان ہیں جو ایک ایسے بھیانک مرض کے ہاتھوں بدہیئت اور اپاہج ہو گئے ہیں جس کا ابھی کچھ عرصہ پہلے تک کوئی معلوم علاج نہ تھا۔ یہ بیماری مریض کو ہلاک تو نہ کرتی تھی لیکن اسے تکلیف اور مصیبت بھری زندگی گزارنے پر مجبور کر دیتی تھی۔ ہاتھوں اور پیروں کے بدہیئت اور ٹوٹے پھوٹے ہو جانے کی وجہ سے وہ کسی باعزت روزگار کے قابل نہ رہتے تھے۔ کوئی شخص اپنے بیٹے یا بیٹی کی شادی کسی ایسے خاندان میں کرنے کا سوچ بھی نہ سکتا تھا جس کا کوئی فرد ''کوڑھی'' ہو۔ اس مرض میں مبتلا سارے لوگ یہاں سماج کے حاشیے پر رہنے پر مجبور تھے۔

یہ میکسیکو سے آئی ہوئی نوجوان فارماسسٹ برنیس تھیں جنھوں نے اس وقت کے آرچ بشپ آف کراچی موں سینیور فان ملٹن برگ کی درخواست پر ۱۶ اگست ۱۹۵۵ کو پہلی بار اس بستی کا دورہ کیا تھا۔ اس میں یونیسیف کے دفتر کی نمائندہ بیٹی مینیرس ان کے ہمراہ تھیں۔

عین داخلے کے راستے پر ایک مرا ہوا کتا پڑا تھا۔ سڑاند اور تعفن سے برنیس کا سر چکرا گیا۔ وہ الٹے قدموں واپس ہوئیں اور کہنے لگیں، ''یہ میرے بس کی بات نہیں!'' دو جذامی جنھوں نے برنیس کو اندر قدم رکھتے دیکھ لیا تھا، پکار اٹھے۔ ان میں سے ایک مسلمان اور دوسرا مسیحی تھا۔ عبدالوہاب نے کہا، ''اللہ کے نام پر!'' مسیحی لزارس نے کہا، ''یسوع مسیح کے لیے!'' ان دونوں کے بدہیئت اور متعفن جسموں پر رینگتے کیڑوں کو دیکھ کر برنیس کو متلی ہونے لگی۔ وہ وہاں رک نہ سکیں اور لوٹ گئیں۔ کانونٹ واپس پہنچ کر بھی ان کی طبیعت

خراب رہی اور ہفتے بھر تک انھیں بھوک نہ لگی۔

میکلوڈ روڈ کے پیچھے کی بستی میں رہنے والے گداگروں نے کسی نہ کسی طرح گرومندر کے پاس واقع سسٹر کی رہائش گاہ کا پتہ لگالیا۔ اب برنیس کے پاس ان کی درخواست قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کیونکہ ان میں سے ایک کے بارے میں بتایا گیا کہ وہ مرنے کے قریب ہے۔ جب وہ دوبارہ وہاں پہنچیں تو لزارس کو بسترِ مرگ پر پڑا پایا۔ آخری وقت کی دعا کے لیے پادری کو طلب کرنا پڑا۔ جب سینٹ پیٹرک کیتھیڈرل کے فادر پنٹو نے لزارس سے اس کی آخری خواہش دریافت کی تو وہ صرف اتنا کہہ سکا، ''میری خواہش ہے کہ سسٹر یہاں رہنے والے ہم جذامیوں کے لیے کچھ کریں۔'' انھوں نے برنیس سے کہا، ''سسٹر، آپ اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر یہاں آئی ہیں، کیا آپ ہمارے لیے کچھ نہیں کرسکتیں؟'' برنیس کو کہنا ہی پڑا، ''ہاں!''

بعد میں برنیس نے میکسیکو کے شہر گواڈالاہارا میں مقیم اپنے والدین کو خط میں لکھا، ''میں آپ کو اور تو سب کچھ بتا سکتی ہوں، لیکن اس بدبو کو بیان نہیں کرسکتی۔'' ان کے والدین اس مقصد کے لیے مدد بھیجنے والوں میں پہلے تھے۔ انھوں نے دوائیں اور پٹیاں بھیجیں۔ برنیس نے کالونی میں پیغام بھجوایا کہ وہ وہاں آنے کو تیار ہیں اگر وہاں سے مرے ہوئے چوہوں کو صاف کردیا جائے اور گٹر کا جو گندا پانی وہاں جمع ہے اس کے نکاس کا بندوبست کیا جائے۔ ایک ہفتے بعد جب وہ وہاں واپس پہنچیں تو کوئی مردہ چوہا دکھائی نہ دیا، اور زمین اگرچہ اب بھی گیلی تھی لیکن وہ اس پر چل سکتی تھیں۔

دوستوں سے اور خود گداگروں سے تین سو روپے کی رقم اکٹھی کی گئی۔ یونیسیف کے دفتر سے خالی کارٹن مانگے گئے۔ اس کے بعد ''جذامیوں'' نے خود ڈسپنسری تعمیر کرنے میں مدد دی۔ لکڑی کے کھوکھوں کی چھت بنائی گئی اور کارڈبورڈ کی دیواریں۔ ریڈکراس نے

دوائیں مہیا کیں۔ کچھ سفارت خانوں سے رابطہ قائم کر کے بستر کی فالتو چادریں جمع کی گئیں اور انھیں پھاڑ کر زخموں کے لیے پٹیاں بنائی گئیں۔ بعد میں کیتھولک ریلیف سروسز نے مدد کے لیے آگے بڑھ کر دودھ کا پاوڈر اور پکانے کا تیل فراہم کیا۔ برنیس مدر سیمیون فیبر اور سسٹر فرانسس براؤن کو ساتھ لے کر کراچی کے پرانے بازار کی ایک دکان پر پہنچیں تاکہ پرانے کپڑے اور کمبل خرید سکیں۔ دو مریضوں کے پاس ایک گدھا گاڑی تھی جس میں رکھ کر یہ سامان اس اسٹور روم تک پہنچایا گیا جو ماما پارسی اسکول کی طرف سے مہیا کیا گیا تھا۔

ایک دن چھوڑ کر برنیس وارگاس، مدر فیبر اور سسٹر براؤن پیدل یا کراچی کی کھٹارا بسوں میں سے ایک پر سوار ہو کر جذام کے ان مریضوں کے پاس پہنچتیں جو کارڈ بورڈ کی بنی ڈسپنسری کے باہر بے تابی سے ان کا انتظار کر رہے ہوتے جس کا نام ان کے کیتھولک آرڈر کی فرانسیسی بانی میری ایڈیلیڈ کے نام پر رکھا گیا تھا۔

برنیس نے اردو کے جو پہلے دو الفاظ سیکھے وہ ''صبح'' اور ''شام'' تھے کیونکہ مریضوں کی دی جانے والی بیشتر دوائیں انھی دو اوقات میں دی جانی ہوتی تھیں۔ بہت جلد مریضوں نے برنیس کو پیار سے ''سسٹر صبح شام'' کا لقب دے دیا۔ برما کے رہنے والے جذام کے مریض رنگونی نے دوسرے ساتھی مریضوں کی انگریزی میں ترجمانی کا کام سنبھال لیا۔

۱۹۵۸ میں جلدی امراض کی ایک پاکستانی نوجوان اور پرکشش ماہر ڈاکٹر برنیس کے پاس آئیں۔ ڈاکٹر زرینہ فضل بھائی، جن کا بچہ کانگریگیشن کے زیرِ اہتمام چلنے والے کنڈرگارٹن میں پڑھتا تھا اور شوہر ایک مالدار تاجر تھے، ہمیشہ جھلملاتی ریشمی ساڑھی میں ملبوس ہوتی تھیں۔ انھیں جلدی امراض کی ایک کانگریس میں، جو کراچی کے ایک ممتاز ہوٹل میٹروپول میں منعقد ہونے والی تھی، پیش کرنے کے لیے جذام سے متعلق معلومات کی ضرورت تھی۔ برنیس اور زرینہ میں فوراً دوستی ہو گئی۔ لیکن زرینہ کو جذامیوں کی بستی میں

جانے کے لیے اپنی ہچکچاہٹ پر قابو پانا ضروری تھا۔

اس دوران مدر فیبر اور سسٹر براؤن جا چکی تھیں اور ان کی جگہ مدر میری ڈائل اور ہیلن لیوٹ نے لے لی تھی۔ جب روتھ فاؤ کراچی ایرپورٹ سے گرومندر والے ہاسٹل میں پہنچیں، اور راستے میں لگی بوگن ویلیا کی باڑھ پر لگے پھولوں پر گلابوں کا گمان کیا، تب ان کی ملاقات مدر ڈائل، ہیلن اور برنیس سے ہوئی۔

ایک بار پھر یہ برنیس ہی تھیں جنھوں نے ایک سہ پہر روتھ کو اپنے ساتھ جذامیوں کی بستی میں چلنے کی دعوت دی۔ وہ دونوں، بید کی ٹوکریوں میں دوائیں اور پٹیاں اٹھائے، ایک پرہجوم بس میں سوار ہو کر وہاں پہنچیں۔ داخلے کے راستے پر گٹر کے پانی کو کھڑا دیکھ کر روتھ کو پہلے تو ہچکچاہٹ ہوئی لیکن پھر انھوں نے برنیس کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اس مصیبت زدہ بستی میں قدم رکھنے کا فیصلہ کیا۔

۷
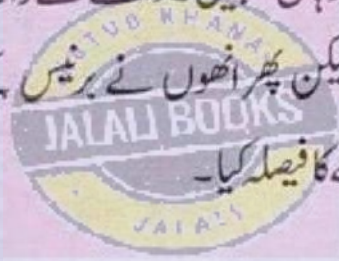
...اور رات میں چوہوں کا حملہ

نہیں! میکلوڈ روڈ (حالیہ آئی آئی چندریگر روڈ) کے عقب میں واقع بستی کے نظارے کے لیے روتھ کو اپنی اس وقت تک کی زندگی نے ہرگز تیار نہیں کیا تھا۔

جس وقت روتھ جرمنی میں بڑی ہو رہی تھیں، یورپ میں جذام ایک بھولا بسرا مرض بن چکا تھا۔ اپنی طبی تربیت کے پورے عرصے میں انھوں نے کبھی کوئی جذام کا مریض نہیں دیکھا تھا۔ وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھیں کہ بیکٹیریا کا پیدا کردہ کوئی انفیکشن، اگر اس کا بروقت علاج نہ کیا جائے، ہلکے سفید یا سرخی مائل بظاہر بے ضرر چکتوں سے شروع ہو کر، جسم کی ایسی بدہیئتی تک پہنچ سکتا ہے۔

انھوں نے جرمنی میں تارکینِ وطن کے چہروں پر چھائی ہوئی پریشانی کا مشاہدہ کیا تھا، دوسری جنگ عظیم میں زخمی سپاہیوں کے جسموں سے بہتا خون اور مسخ شدہ لاشیں دیکھی تھیں۔ لیکن پاکستان کے دارالحکومت اور سب سے بڑے شہر کراچی کے بڑے کاروباری مرکز کے عقب میں جذامیوں کی بستی میں انھیں جو کچھ دکھائی دیا وہ ناقابلِ یقین تھا۔ نابینا مرد اور عورتیں، مسخ شدہ ناکیں، مڑے ہوئے چہرے، گلے ہوئے ہاتھ اور پاؤں، پیپ

بھرے متعفن زخم، اردگرد بھنبھناتی مکھیاں اور سڑتے ہوئے گوشت کو کترتے چوہے۔

کانونٹ کی تیس سالہ شاگردہ، جس نے ناداری، پاکیزگی اور اطاعت کی قسم کھائی تھی، جس نے اپنی زندگی انسانی مصائب کے خلاف جدوجہد کے لیے وقف کرنے کا عہد کیا تھا، اپنی زندگی کے مقصد تک آ پہنچی تھی۔ اس سے بڑی انسانی ابتلا دنیا میں اور کہیں نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ وہ تقدیر ساز لمحہ تھا جب انھوں نے پاکستان میں بس جانے کا فیصلہ کیا۔

زندگی کا یہی وہ مقصد تھا جس نے انھیں یہ کہنے پر مجبور کیا تھا، ''مجھے افسوس ہے گوئنتھر، لیکن میں ہاں نہیں کہہ سکتی۔ میری زندگی کسی اور مقصد کے لیے وقف ہے۔''

برنیس نے ڈسپنسری قائم کرنے کے لیے سخت محنت کی تھی۔ انھوں نے جذام کے تقریباً ڈیڑھ سو مریضوں کے متواتر رستے ہوئے زخموں اور گھاؤوں کا علاج کرنے اور ان کے خاندانوں کی دیکھ بھال کرنے کی اپنی سی تمام تر کوشش کی تھی، لیکن وہ ڈاکٹر نہیں تھیں۔

ڈاکٹر آنا روچا اور ڈاؤ میڈیکل کالج کے تین طالب علم وقتاً فوقتاً ان کی مدد کر دیا کرتے تھے، لیکن یہ رضا کار صرف جز وقتی کام کے لیے دستیاب تھے۔ آخر کار انھوں نے پیرس میں اپنے کانگریگیشن سے ایک خاتون ڈاکٹر یہاں بھیجنے کی استدعا کی تھی۔

روتھ نے جذام کے موضوع پر لکھی جانے والی مستند کتابیں پڑھیں جن میں رابرٹ کوچرین کی کتاب شامل تھی۔ پھر انھوں نے امریکی معالج جذام اور تامل ناڈو، ہندوستان، کے شہر ویلور میں قائم کرسچین میڈیکل کالج کے پرنسپل ڈاکٹر پال برانڈ کو خط لکھا؛ دنیا بھر میں ہندوستان ایسا ملک تھا جہاں جذام سے متاثر ہونے والے سب سے زیادہ افراد رہتے تھے۔ ڈاکٹر برانڈ نے انھیں ویلور آ کر تربیتی کورس کرنے کی دعوت دی۔

۱۹۶۱ میں روتھ ہوائی جہاز کے ذریعے کراچی سے مدراس اور وہاں سے بس میں سوار ہو کر ویلور پہنچیں جو دریائے پالار کے کنارے واقع ایک خوشحال تجارتی قصبہ ہے اور

کرسچین میڈیکل کالج اور اسپتال کے لیے معروف ہے جسے ۱۹۰۰ میں امریکی مشنری ارا اسکڈر نے قائم کیا تھا اور جو ہندوستان کے وسیع ترین اسپتالوں میں سے ایک ہے۔

ہر صبح روتھ گہرے سبز رنگ سے ڈھکے گنے کے کھیتوں کو پار کر کے اسپتال میں قائم جذام کی تحقیق اور جذامیوں کی بحالی کے شہرت یافتہ مرکز پہنچتیں۔ راستے میں انھیں ہر طرف اچھلتے کودتے بندر اور ناریل کے ایک پیڑ سے اڑ کر دوسرے پیڑ پر جاتے طوطے دکھائی دیتے۔ اسپتال کے اس مرکز میں انھوں نے جذام کی تشخیص اور علاج کے بارے میں نئی معلومات اور مہارت حاصل کی۔ جنوبی ہند میں اپنے قیام کا انھوں نے بے حد لطف اٹھایا۔ وہ کیلے کے پتوں پر پروسے ہوئے چاول اور ترکاری کھاتیں، کھلے دیہاتی علاقے میں سائیکل چلاتیں اور گرمجوش ہندوستانی عورتوں سے دوستیاں کرتیں۔ چھ ہفتے کی سخت تربیت مکمل کر کے وہ رنگین مندروں اور رقص کرتی دیویوں کے اس دیس سے نکل کر واپس توحید کے مرکز پاکستان چلی آئیں۔

وہ میکلوڈ روڈ کی بستی میں ایک نئے ولولے کے ساتھ لوٹیں اور اپنے کام کی نئے سرے سے تنظیم کی۔ باقاعدہ رجسٹریشن، مریض کی ترتیب وار تفصیلات کے اندراج اور طبی ٹیسٹ کرنے کا نظام قائم کیا گیا اور سادہ لیبارٹری ٹیسٹ شروع کیے گئے۔ جذام کے ایک زیر علاج مریض عبدالرحمٰن کو، جس کے ہاتھ مرض کے ہاتھوں مسخ ہو چکے تھے، خوردبین کے استعمال کی تربیت دی گئی۔ وہ تدریس کے پیشے سے وابستہ رہ چکے تھے اور بستی کے واحد فرد تھے جس نے گداگری کا پیشہ اختیار کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ٹی بی سینٹر کے اسپیشلسٹ ڈاکٹر یاد نے مہربانی کر کے عبدالرحمٰن کو لیبارٹری ٹیکنیشین کے کورس میں داخلہ دے دیا، حالانکہ کورس میں شامل دوسرے طالب علموں نے ایک جذامی کو داخلہ دیے جانے کی صورت میں کورس کا بائیکاٹ کرنے کی دھمکی دی تھی۔ عبدالرحمٰن نے چھ ماہ کا کورس بڑی

کامیابی سے مکمل کیا اور ڈسپنسری میں واپس آ کر اپنا کام سنبھال لیا۔ خوردبین ان کی گود میں رکھی ہوتی کیونکہ اسے رکھنے کے لیے علیحدہ میز کی وہاں جگہ نہ تھی۔

اُن دنوں ڈاکٹر جذام کے کسی مریض کو اپنے کلینک یا اسپتال میں داخل ہونے دینے کے روادار نہ ہوتے تھے۔ جب مظہر حسین کے پیر میں گنگرین ہو گیا تو جناح اسپتال کے ہڈیوں کے سرجن نے اس کا آپریشن کرنے کی ہامی بھر لی، لیکن یہ آپریشن اسپتال کے مردہ خانے ہی میں کیا جا سکا۔ آپریشن کے بعد جب مظہر حسین کو ٹیٹنس کی تکلیف ہو گئی تو روتھ کے آنسو نکل آئے۔ وہ ایک کے بعد دوسرے اسپتال میں مدد حاصل کرنے کے لیے دوڑتی پھریں اور آخر کار سول اسپتال کے یونٹ میں پہنچیں۔ اسسٹنٹ ڈاکٹر نے مظہر کو اسپتال کے پچھواڑے کے برآمدے میں داخل کیا۔ مریض کی حالت بہتر ہو گئی لیکن اسسٹنٹ ڈاکٹر کو اسپتال کے سپرنٹنڈنٹ کی طرف سے جواب طلبی کا سامنا کرنا پڑا۔ اپنے جواب میں ڈاکٹر جعفر علی ہاشمی نے لکھا، ''سر، اگر میں اس مریض کو داخل کرنے سے انکار کر دیتا جسے ایک غیر ملکی خاتون خود اپنے ساتھ لے کر آئی تھیں جنھیں ہمارے ملک کے اس قانون کا علم تھا کہ اسپتال میں داخل ہونا ہر مریض کا حق ہے، تو کیا یہ بات آپ کو پسند آتی؟'' اس جواب نے ڈاکٹر ہاشمی کو برطرفی سے بچا لیا لیکن ان کا تبادلہ فوری طور پر میونسپلٹی کے جذامی علاج کے مرکز میں کر دیا گیا جو بہت دور منگھو پیر میں واقع تھا۔

اس سے پہلے کئی ڈاکٹر اس مرکز میں تعینات ہونے سے انکار کر چکے تھے لیکن ڈاکٹر ہاشمی نے اپنے تبادلے کو خندہ پیشانی سے قبول کیا اور ڈاکٹر روتھ سے مدد کی درخواست کی تاکہ اس خستہ حال مرکز کو نئے سرے سے بحال کیا جا سکے۔ میکلوڈ روڈ کی بستی اور منگھو پیر کے مرکز کے درمیان ہفتے میں دو بار کے دوروں کا انتظام کیا گیا اور اس طرح یہ ادارہ دوبارہ کارآمد بنا لیا گیا۔ ڈاکٹر ہاشمی نے خود کو ایک قابل منتظم ثابت کیا۔

آنکھوں کے امراض کے اسپنسر اسپتال کے اسپیشلسٹ ڈاکٹر ایم ایچ رضوی بھی ان معدودے چند ڈاکٹروں میں سے ایک تھے جو کسی جذامی کو اپنے اسپتال میں داخلہ دینے سے انکار نہیں کرتے تھے۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ جاتے کہ روتھ مریضوں کو ساتھ لے کر بس کے ذریعے پہلے لی مارکیٹ اور پھر پیدل ان کے اسپتال پہنچتیں، صرف اس غرض سے کہ کسی طرح ان مریضوں کی بینائی بچائی جا سکے۔

اپنے مقصد سے یہی لگن تھی جس سے متاثر ہو کر ڈاکٹر زرینہ نے ۱۹۶۲ میں میکلوڈ روڈ کی بستی میں قدم رکھا۔ جب قیمتی لباس میں ملبوس ماہرِ امراضِ جلد خستہ حال ڈسپنسری میں داخل ہوئیں تو روتھ نے انھیں ایک مالدار گھرانے کی بیگم سمجھا جو شاید بریانی کی چند دیگیں بطور خیرات لے کر آئی ہوں گی اور انھیں وہاں چھوڑ کر فوراً باہر نکل جائیں گی۔ لیکن زرینہ نے اپنی استقامت کو ثابت کیا۔ ان کی پرائیویٹ پریکٹس بہت عمدہ چل رہی تھی اور پہلے پہل انھوں نے مائیکرواسکوپی کی خدمات فراہم کرنے کی پیشکش کی، لیکن بہت جلد نوجوان غیر ملکیوں کی مدد کے لیے ان کے زیرِ اہتمام چلنے والی اس ڈسپنسری کا ہر کام سنبھال لیا۔ یہ سب عورتیں تھیں، الگ الگ سرزمینوں سے آئی تھیں، مختلف زبانیں بولتی تھیں، لیکن ناداروں کی مدد کرنے کا جذبہ آپس میں مشترک رکھتی تھیں۔

انھی دنوں انگلستان کی ملکہ الزبتھ دوم نے پاکستان کا دورہ کیا۔ ان کے ساتھ بڑی تعداد میں مغربی صحافی بھی آئے۔ کراچی کی بڑی تجارتی شاہراہ سے گزرتے ہوئے چند صحافی جذامیوں کی بستی میں بھی آ نکلے۔ چند ہفتے بعد ایک جرمن ٹیبلوائڈ اخبار ''بلڈ'' میں ایک مضمون شائع ہوا جس کا عنوان تھا: ''... اور رات میں چوہوں کا حملہ!'' اس سنسنی خیز سرخی نے وورزبرگ میں رہنے والے ہرمن کوبیر کی توجہ اپنی جانب کھینچی۔ اتفاق سے کوبیر جرمن لیپرسی ایسوسی ایشن کے صدر تھے۔ انھوں نے فوراً کراچی میں روتھ فاؤ کی رہائش گاہ

کا پتہ دریافت کیا اور انھیں خط لکھا: ''یہ کس طرح ہوا کہ ایک جرمن ڈاکٹر جذام کے خلاف کام کر رہی ہے اور جرمن لیپرسی ایسوسی ایشن کو اس کی خبر تک نہیں۔'' جواب میں روتھ نے لکھا: ''یہ کس طرح ہوا کہ جذام کے خلاف کام کرنے والی ایک جرمن ڈاکٹر کو خبر تک نہیں کہ کوئی جرمن لیپرسی ایسوسی ایشن بھی وجود رکھتی ہے۔'' جرمنی سے آنے والے شائستہ پیغام میں دریافت کیا گیا: ''ہم آپ کے لیے کیا کر سکتے ہیں؟'' میکلوڈ روڈ کی جانب سے اپنی کارڈبورڈ کی بنی ڈسپنسری کی تصویر بھیجی گئی جس میں کسی قسم کے آلات تھے نہ تربیت یافتہ عملہ۔ وورزبرگ میں ایسوسی ایشن کے دفتر نے فوراً ڈسپنسری کے لیے سامان روانہ کیا اور ساتھ میں ایک تربیت یافتہ نرس سسٹر ایلی کو بھی بھیجا۔

انھی دنوں ترقی پذیر ملکوں میں ترقیاتی منصوبوں پر کام کرنے والے جرمن بشپس کی تنظیم ''میسریور'' کے ایک وفد نے کراچی کا دورہ کیا۔ ان کے نمائندے نے روتھ سے دریافت کیا، ''آپ ڈسپنسری کی عمارت کیوں نہیں بنوا لیتیں؟'' ''میرے پاس اس کے لیے رقم کہاں ہے؟'' سوال کے جواب میں سوال کیا گیا۔ نمائندے نے عندیہ دیا کہ جرمنی کے لوگ اس سلسلے میں ہاتھ بٹا سکتے ہیں۔ اس بات نے ایک امکان کا دروازہ کھول دیا۔ شہر کے مرکزی علاقے صدر میں ایک دومنزلہ نرسنگ ہوم اس کے مالک ڈاکٹر پنٹو سے خرید لیا گیا جو انگلستان منتقل ہو رہے تھے۔ اس کی قیمت میسریور نے ادا کی۔

نرسنگ ہوم کے سامنے واقع کلینک کی مخالفت کے پیش نظر ''میری ایڈیلیڈ ڈسپنسری'' کو نئی عمارت میں ۱۹ اپریل ۱۹۶۳ کی رات کے اندھیرے میں منتقل کیا گیا۔ پڑوسیوں کو اس کا علم صبح کے وقت ہوا اور انھوں نے انڈوں، ٹماٹروں، پتھروں اور گالیوں سے خیر مقدم کیا؛ یہ سب چیزیں ڈسپنسری کی بغیر شیشوں کی کھڑکیوں سے گزر کر اندر پہنچیں۔ جب روتھ کے کانوں میں ''گدھے کے بچے'' کے الفاظ پڑے تو یہ انھیں خاصے دلکش محسوس ہوئے۔

انھیں سمجھانے کی ضرورت پیش آئی کہ ان الفاظ کا مطلب کیا ہے۔

اس کے بعد عدالت میں ایک مقدمہ شروع ہوا جو روتھ اور زرینہ نے مل کر لڑا اور آخر کار جیت لیا۔ اس میں جذام کے علاج کے بین الاقوامی ماہروں مثلاً ڈاکٹر پال برانڈ، ڈاکٹر اسٹینلے براؤن اور عالمی ادارۂ صحت کے جذام کے مشیر ڈاکٹر اے میکلوی کے خطوط نے اہم کردار ادا کیا۔

ڈاکٹر میکلوی ہی نے روتھ کو مشورہ دیا کہ وہ جذام کے انسداد کے مقامی منصوبے میونسپل لیپرسی کنٹرول پروگرام کو دوبارہ فعال کرنے کی کوشش کریں جو بہت دنوں سے عملاً بے مصرف ہو چکا تھا۔ جب روتھ اس پروگرام کے انچارج سے ملنے پہنچیں تو نمایاں توند والے پان چباتے شخص نے انھیں مسکراتے ہوئے اپنے کلینک دکھانے کی پیشکش کی۔ جب وہ گاڑی میں سوار ہو کر غیر فعال کلینکوں کے تالے پڑے دروازوں تک پہنچتے تو کوئی چوکیدار یا چپراسی انچارج سے پوچھ بیٹھتا کہ اس کے ساتھ یہ خاتون کون ہے۔ یہ فرض کرتے ہوئے کہ انھیں اردو نہیں آتی ہوگی، انچارج اپنے پان کی پیک سے بھرے منہ سے بڑے فخر سے کہتا، ”یہ ہماری گڑیا ہیں!“ تاہم گڑیا کو اب تک اتنی اردو آچکی تھی کہ یہ بات اس کی سمجھ میں آگئی لیکن وہ منہ بند کیے بیٹھی رہی۔

ایک بار پھر یہ ڈاکٹر میکلوی ہی تھے جنھوں نے سوات کے ایک دورے کے بعد روتھ سے سلطان محمد کا ذکر کیا اور مشورہ دیا کہ وہ سلطان محمد کو کراچی بلوا کر جذام کے ٹیکنیشین کے طور پر تربیت دیں۔ سلطان محمد ایک نوجوان پیرامیڈیکل ورکر تھے اور سوات کے ایک گاؤں پیر بابا کی ڈسپنسری میں کام کرتے تھے۔ پیر بابا کی درگاہ پاکستان کے پورے شمالی حصے میں جذام کے مریضوں کی پناہ گاہ تصور کی جاتی تھی۔ ان مریضوں میں سے بہت سے ایک ایک کر کے کراچی آجاتے اور گداگری کرنے لگتے۔ ریاست سوات کے نیک دل والی

نے درگاہ کے پاس ان بدنصیب جذامیوں کے لیے ایک ڈسپنسری اور اس کے اردگرد رہنے کے لیے چند مکان بنوا دیے تھے۔ ڈاکٹر میکلوی نے والیِ سوات عبدالحق اورنگزیب سے سلطان محمد کی کراچی میں تربیت کی اجازت پہلے ہی لے لی تھی۔

۸
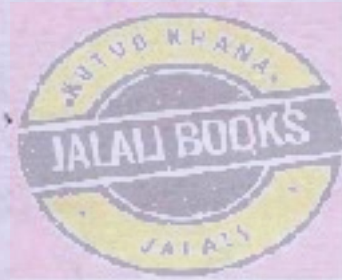
جذبہ مہم جوئی کا

سلطان محمد ۱۹۶۵ میں جذام کے ٹیکنیشنوں کے پہلے دستے میں شامل ہوکر چھ ماہ کا تربیتی کورس کرنے کے غرض سے کراچی پہنچے۔ روتھ نے زرینہ کی مدد سے کورس کا نصاب تیار کیا اور دونوں نے مل کر امیدواروں کے ایک مختصر گروپ کو اناٹومی، فزیالوجی اور جذام کے مرض کے بارے میں بنیادی تعلیم دینا شروع کیا۔ ان امیدواروں میں میری ایڈیلیڈ لیپرسی سینٹر اسپتال اور میونسپلٹی کے کارکنوں کے علاوہ بلاشبہ سلطان محمد بھی شامل تھے۔

کورس کے مکمل ہوتے ہوتے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان پہلی بڑی جنگ چھڑ گئی۔ جرمن سفارت خانے نے روتھ کو پاکستان سے چلے جانے کا مشورہ دیا۔ لیکن انھوں نے انکار کر دیا۔ ہوائی حملے کے سائرن، بلیک آؤٹ اور کراچی میں ہونے والے دھماکوں کی آوازیں انھیں اپنے بچپن میں دوسری عالمی جنگ کے تجربات کی یاد دلا رہی تھیں۔ اسپتال کی کھڑکیوں کے شیشوں کو فوراً پردوں سے ڈھک دیا گیا، اور ایمرجنسی کی صورت حال میں بچاؤ کے لیے ریت کی بوریاں حاصل کی گئیں۔ جیسے ہی سائرن کی آواز گونجتی، تمام مریضوں کو زمینی منزل پر واقع محفوظ راستے پر پہنچایا جاتا۔ جب تک ہوائی حملے

کا خطرہ برقرار رہتا، روتھ مریضوں کے ساتھ رہتیں۔

سترہ دن کی جنگ کا اختتام جنگ بندی پر ہوا۔ جو منصوبے ملتوی کر دیے گئے تھے اب ان پر عمل شروع ہوا۔ اب شمال مغربی سرحدی صوبے کا دورہ کرنے کا وقت آ گیا تھا تاکہ اس کام کی رہنمائی کی جا سکے جو تربیت یافتہ لیپرسی ٹیکنیشین نے وہاں شروع کیا تھا۔

مدر میری ڈائل نے، جو اب اسپتال کے تمام انتظامی معاملات سنبھال چکی تھیں، اس سفر میں روتھ کے ہمراہ چلنے کی پیشکش کی۔ ننھے گلابی پھولوں والی سرمئی رنگ کی شلوار قمیص پہنے اور اسی رنگ کے دوپٹے سے اپنے سر اور کندھوں کو ڈھانپے روتھ مدر ڈائل کے ساتھ پشاور جانے والے ایک ہوائی جہاز پر سوار ہوئیں۔ سلطان محمد، جسے ان کی آمد کی اطلاع پہلے سے دے دی گئی تھی، پشاور ایرپورٹ پر کہیں دکھائی نہ دیا۔ بہت دیر انتظار کرنے کے بعد مدر ڈائل نے ایک تانگے والے سے کہا کہ وہ انھیں مین بازار پہنچا دے جہاں سے وہ پیر بابا جانے کے لیے ٹیکسی حاصل کر سکیں۔ دونوں خواتین تانگے کی پچھلی سیٹ پر سڑک کی طرف رخ کر کے بیٹھ گئیں۔ روتھ شلوار قمیص میں اور مدر ڈائل گھٹنوں تک لمبے اسکرٹ میں ملبوس۔ لیکن سیٹ پر بیٹھنے سے اسکرٹ سمٹ کر ان کے گھٹنوں سے اوپر سرک آیا۔ ہوتے ہوتے تانگے کے پیچھے سائیکل سوار نوجوان پٹھان لڑکوں کا ایک جلوس چلنے لگا جو ہوا میں پھڑ پھڑاتی ڈھیلی شلوار قمیصیں پہنے تھے اور مدر ڈائل کی سڈول پنڈلیوں کا نظارہ کرتے ہوئے خوشی سے نعرے لگا رہے تھے۔ شرمندگی سے روتھ کا رنگ پیلا پڑ گیا، لیکن ساٹھ برس کی آئرش امریکی مدر ڈائل، دراز قد اور اپنے خوش وضع اسکرٹ میں بھاری بھرکم دکھائی دیتی ہوئی، اس سرحدی شہر کی درختوں سے سجی سڑکوں پر خود کو ملنے والی اس تمام توجہ کا لطف اٹھاتی رہیں۔

بازار میں پہنچ کر وہ ٹیکسی کی تلاش میں کھڑی ہو گئیں اور انھوں نے خود کو وہاں موجود مردوں میں تنہا اور سب کی بے پناہ توجہ کا مرکز پایا۔ ان کے ارد گرد گزرتے ہوئے مردوں

کے چہروں پر خشونت تھی اور کندھوں پر بندوقیں لٹک رہی تھیں۔ اچانک روتھ کی نظر سلطان محمد پر پڑی جو ان کی طرف چلا آ رہا تھا۔ آنکھیں چار ہوتے ہی سلطان محمد نے خدا کا شکر ادا کیا اور روتھ نے خداوند کا۔ جلد ہی وہ تینوں ایک بس میں سوار سوات کی طرف رواں دواں تھے۔

بس پشاور کی وادی کے سرسبز کھیتوں سے نکل کر ایک سنگلاخ راستے پر ہوتی ہوئی بلند و بالا پہاڑوں کی طرف چلی۔ ناہموار راستے کے ایک طرف اونچے پہاڑ تھے اور دوسری طرف گہری کھائیاں۔ جب گنجائش سے زیادہ بھری ہوئی بس تنگ راستے پر چلتے ہوئے دائیں اور بائیں لہراتی تو مدر ڈائل اپنی تسبیح نکال لیتیں۔ روتھ اس قدر خوفزدہ ہو چکی تھیں کہ جب سلطان محمد نے انھیں بتایا کہ اس کا آبائی شہر آ پہنچا ہے تو انھیں یقین نہ آیا۔

درگاہ کے رہائشی حصے میں دونوں غیر ملکی خواتین کے رہنے کا بندوبست کیا گیا۔ مسئلہ صرف یہ تھا کہ وہاں نہ کوئی بیت الخلا تھا اور نہ ان کے غسل کے لیے کوئی جگہ۔ صرف چشمے کے اوپر کی کھلی جگہ اس کام کے لیے موجود تھی۔ روتھ کو اس خوبصورت ماحول کو گندا کرنے پر ندامت محسوس ہوئی۔

اگلی صبح اٹھ کر انھوں نے پہاڑوں کی عالیشان چوٹیوں، ان کی ڈھلانوں پر اگے دیودار، صنوبر اور فر کے درختوں اور نیچے چراگاہوں میں چرتی بھیڑوں کا وسیع نظارہ دیکھا۔ روتھ اس حسین نظارے سے متاثر ہو کر دعا اور مراقبے میں ڈوب گئیں۔

گرم خوشبودار قہوے کی پیالی اور خستہ نان کے ناشتے کے بعد ان کے کام کا آغاز ہوا۔ گاؤں کا سروے کیا گیا، مردوں، عورتوں اور بچوں کا معائنہ کیا گیا، دوائیں دی گئیں اور زخموں کی مرہم پٹی کی گئی۔ جب ایک طویل اور تھکا دینے والے دن کے بعد آرام کرنے کا وقت آیا تو چوکیدار شمشیر نے اپنی چارپائی کھینچ کر عورتوں کے رہائشی حصے کے دروازے کے

پاس کرلی تا کہ دونوں غیر ملکی خواتین مہمانوں کی حفاظت کر سکے۔ پاکستانیوں کی نرم خومہمان نوازی نے دونوں کو بہت متاثر کیا۔ دن کے وقت انھوں نے محسوس کیا تھا کہ سڑک کے دوسری طرف سے آتے ہوئے مرد کس طرح دور سے انھیں دیکھتے ہی نظریں پھیر لیتے تھے۔ بظاہر کرخت دکھائی دینے والے اور کندھوں پر بندوقیں لٹکائے پٹھانوں کی خوش اخلاقی ان اچھلتے ہوئے چشموں کی طرح تھی جو اس شاندار سرزمین سے گزرتے تھے۔

چند ہفتے وہاں گزار کر روتھ کراچی لوٹ آئیں، اس بات پر خوش کہ چھ مہینے کے تربیتی کورس سے مقامی لڑکوں کو اس قابل کر دیا تھا کہ وہ فیلڈ میں اپنا کام اچھی طرح سنبھال سکیں۔ اس حقیقت نے کہ وہ اس پہاڑی علاقے میں آزادی سے ہو آئی تھیں جہاں اپنے باپ یا شوہر کے گھر سے نکل کر جاتے ہوئے عورتیں ہچکچاتی تھیں، روتھ کو ایک تسکین کا احساس بخشتا تھا۔ مردوں سے بھرے ہوئے حجرے سے لے کر ڈپٹی کمشنر کے دفتر تک وہ جہاں بھی گئیں، لوگ ان کے ساتھ احترام سے پیش آئے۔ انھیں اس سرزمین سے محبت ہو گئی جہاں انھیں اس قدر اپنائیت محسوس ہوئی تھی۔ ان کے اردگرد کی فضا مہم جوئی سے لبریز تھی۔

کراچی لوٹ کر ان کی ملاقات سوات کے رہنے والے ایک دیہاتی سے ہوئی۔ وہ گاؤں کے جرگے میں بزرگوں کے فیصلے کی ٹن گن پا کر کراچی بھاگ آیا تھا۔ لوگوں نے اس کی جلد پر پڑے خوفناک چکتے دیکھ لیے تھے۔ آس پاس کے دیہات میں "کوڑھی" کا مقدر ہمیشہ سے صرف موت ہوتا تھا۔

چند مہینوں کے کامیاب علاج اور اچھی طرح تسلی دینے کے بعد اسے اس کے گاؤں واپس بھیج دیا گیا۔ کئی سال بعد جب روتھ نے اس کے گاؤں کا دورہ کیا تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئیں کہ وہ اپنے گاؤں کا سردار بن چکا ہے، مسرور شادی شدہ زندگی گزار رہا ہے اور صحت

مند بچوں کا باپ ہے۔ خدا کے کام بھی عجیب ہوتے ہیں، روتھ نے مسکراتے ہوئے سوچا۔

علاج تک رسائی کا مسئلہ صرف پہاڑی علاقوں کے دیہات تک محدود نہ تھا بلکہ کراچی میں بھی، خاص طور پر پسماندہ بستیوں کے رہنے والوں کے لیے اسی قدر سنگین تھا۔ اس مسئلے کے پیشِ نظر ۱۹۶۳ ہی میں ملیر کے ایک سرکاری اسپتال کے خالی سرونٹ کوارٹر میں ایک کلینک قائم کیا گیا۔ لانڈھی کا کلینک ایک درخت کے نیچے ۱۹۶۴ میں شروع ہوا اور بعد میں اسے ایک خالی اسٹور روم میں منتقل کیا گیا۔ آخر کار ۱۹۷۰ کے عشرے کے آغاز میں جرمنی سے آنے والے عطیات کی مدد سے ان کلینکوں کے لیے نئے الگ یونٹ حاصل کیے گئے۔

۹

دوستی کے لعل و گہر

جرمنی کے جن لوگوں نے پاکستان کے جذام کے مریضوں کے لیے اپنی محنت کی کمائی میں سے عطیات بھیجے وہ وہاں کے مالدارترین لوگ نہیں تھے۔ وہ عام محنت کش شہری تھے، جیسے مسز شرائینر۔ یہ خاتون روتھ سے پہلی بار اس وقت ملی تھیں جب روتھ ونٹر برگ کے اسپتال میں ایک نوعمر انٹرن کے طور پر کام کر رہی تھیں۔ مسز شرائینر ایک قریبی گاؤں سے دوستوں کی ایک ٹولی کے ہمراہ ونٹر برگ آئی تھیں تاکہ شہر کے پاس واقع اسکی اِنگ کے مرکز میں جاکر تفریح کرسکیں۔ بس سے اترتے ہوئے ان کا پاؤں پھسل گیا اور سر میں سخت چوٹ آئی۔ انھیں اسپتال میں کئی ہفتوں تک مکمل آرام کرنے کا مشورہ دیا گیا۔ ان کی تنہائی دور کرنے کے لیے نوعمر انٹرن نے انھیں ایک چھوٹا سا ٹرانزسٹر ریڈیو لا دیا۔ صحت یاب ہونے کے بعد مسز شرائینر ریڈیو واپس دینے گئیں۔ ڈاکٹر روتھ نے اسے واپس لینے سے انکار کر دیا۔ ڈاکٹر اور مریض نے گرمجوشی سے بغلگیر ہو کر ایک دوسرے کو الوداع کہی۔

برسوں بعد مسز شرائینر نے کسی جگہ ڈاکٹر روتھ کا ذکر پڑھا کہ وہ دور دراز کے ملک پاکستان میں کام کر رہی ہیں۔ انھیں یہ نام جانا پہچانا سا لگا۔ انھوں نے دیے گئے پتے پر خط

لکھ کر دریافت کیا، ’’کیا آپ وہی روتھ فاؤ ہیں؟‘‘ اثبات میں جواب ملنے پر مسز والٹراڈ شرائینر نے ’’فرینڈز آف کراچی‘‘ کے نام سے ایک گروپ منظم کیا جو پورے ساورلینڈ کے علاقے میں سفر کرتے ہوئے ایپل جوس بیچتا، اسکولوں میں میلے اور مینابازار منعقد کرتا اور ’’پاکستان میں جذام پر فتح پانے‘‘ کے مقصد ان طریقوں سے اونی کمبلوں اور چھوٹی چھوٹی رقموں کے عطیات جمع کرتا گھومنے لگا۔ اس طرح انھوں نے لاکھوں جرمن مارک کی رقم اکٹھی کی جسے پاکستان بھجوا دیا گیا۔ اور مسز شرائینر محض ایک عام بینک ملازم تھیں۔ جب روتھ نے انھیں شکریے کا پیغام بھیجا تو ان کا جواب تھا، ’’ہم پاکستان کی مدد کے لیے جو بھی تھوڑا بہت کرتے ہیں اس کا ہمیں صلہ واپس ملتا ہے۔ ہمارے نوجوان انسانیت کی خدمت کرنے کی خواہش رکھتے ہیں اور [illegible] بڑی عمر کے لوگ مددگار ثابت ہونا چاہتے ہیں۔ اس طرح ہم سب کو اپنی خواہش پوری کرنے کے چھوٹے چھوٹے موقعے مل جاتے ہیں۔ ہمیں تو خود آپ کا شکر گذار ہونا چاہیے۔ آپ کی، والٹراڈ شرائینر۔‘‘

اس کے علاوہ میری این تھیں جنھیں چوبیس برس کی عمر میں پولیو کا مرض لاحق ہو گیا تھا اور چلنے پھرنے کے لیے ویل چیئر کی ضرورت پڑ گئی تھی۔ جب ۱۹۶۸ میں روتھ پہلی بار اپنے وطن واپس گئیں تو انھوں نے اپنی خصوصی کار میں انھیں پورے جرمنی کی سیر کرائی۔ روتھ کی والدہ ان کا خیر مقدم کرنے خاص طور پر ایر پورٹ آئیں اور ان کے ساتھ ساتھ ہر جگہ گئیں جہاں روتھ سلائیڈ شو اور تقریروں کے ذریعے پاکستان میں جذام کے انسداد کے پروگرام کے بارے میں لوگوں کو بتاتی رہیں۔ جب لوگ ان کے پاس آ کر احترام بھری آواز میں ان سے سرگوشی کرتے، ’’آپ کیسی غیر معمولی ماں ہیں کہ آپ نے روتھ جیسی غیر معمولی بیٹی کی پرورش کی ہے،‘‘ تو وہ شرم سے سرخ ہو جاتیں۔ وہ اپنے دل کی گہرائیوں میں خدا کا شکر ادا کرتی تھیں کہ اس نے انھیں روتھ کی ماں کے طور پر چنا تھا۔

روتھ کی بہن آرمگارڈ جو ان سے دو برس بڑی تھیں اور جنھوں نے قانون کی تعلیم حاصل کی تھی، ۱۹۷۱ء میں بھاگم بھاگ کراچی پہنچیں تا کہ اس قانونی قضیے سے نمٹنے میں میری ایڈیلیڈ لیپرسی سینٹر کے وکیل اے کے بروہی کی مدد کرسکیں جو ایک جوشیلے یونین لیڈر کی وجہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ آرمگارڈ جو بچپن میں روتھ سے لڑنے جھگڑنے والی بڑی بہن رہی تھیں، بعد میں سات برس تک کراچی میں رہیں اور مریضوں اور اسپتال کے کارکنوں کی فلاح و بہبود کی اسکیمیں تیار کرنے میں روتھ کی مدد کرتی رہیں، جن میں خاص طور پر ایک رہائشی منصوبہ شامل تھا جس کے لیے رقم ایک جرمن صنعتکار ریکس روتھ نے فراہم کی تھی اور جسے بے حد سراہا گیا۔

بہت سے پاکستانی مردوں اور عورتوں نے بھی آگے بڑھ کر کھلے دل سے اسپتال کی مدد کی۔ ان میں مسز (جسٹس) فیروز نانا بھی شامل تھیں۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ مظہر حسین جذام کے مرض سے صحت یاب ہونے کے بعد اپنی ماں کو اپنی خوشی میں شریک کرنے کے لیے ہندوستان جانا چاہتا ہے تو مسز نانا نے رازداری سے اس کے پورے سفرخرچ کا بندوبست کیا۔ ان کی بیٹی بڑی ہو کر ماہرِ تعلیم بنیں اور اپنے صوبے کی وزیرِ تعلیم کے عہدے تک بھی پہنچیں۔ پروفیسر انیتا غلام علی خواہ کتنی بھی مصروف کیوں نہ ہوں، میری ایڈیلیڈ لیپرسی سینٹر اور اس کے مریضوں کے لیے ہمیشہ وقت نکال لیتی ہیں۔

ڈاکٹر زرینہ فضل بھائی نے، جنھیں سماجی تقریبات منعقد کرنے میں خاص ملکہ حاصل تھا، سرکاری افسروں اور ملٹی نیشنل اداروں سے رابطہ قائم کر کے اسپتال کے لیے امداد جمع کی۔ انھوں نے اپنے پورے خاندان کو ان کوششوں میں شامل کرلیا۔ ان کا بیٹا جذام کے مریضوں کو ٹیوشن پڑھاتا، بیٹی اسپتال کے ریکارڈ میں اندراجات کرتی اور ہنس مکھ اکبر فضل بھائی ہمیشہ یہ شکایت کرتے ہوئے آتے کہ میری ایڈیلیڈ لیپرسی سینٹر نے ان کی حسین بیوی کو

ان سے چھین لیا ہے۔

لیکن موت زرینہ کو نہ صرف ان کے محبت بھرے خاندان سے بلکہ میری ایڈیلیڈ لیپرسی سینٹر اور اس کے ان ہزاروں مریضوں سے بھی چھین کر لے گئی جن کا انھوں نے اتنے پیار اور توجہ سے علاج اور دیکھ بھال کی تھی۔

جب کچھ مخالفوں نے یہ الزام لگایا کہ غیر ملکیوں کا یہ گروپ لوگوں کو عیسائی بنانے کے لیے یہاں آیا ہے تو زرینہ ہی تھیں جنھوں نے آگے بڑھ کر انھیں سیدھا جواب دیا، ''میں ان لوگوں کے ساتھ برسوں سے کام کر رہی ہوں۔ میں مسلمان تھی، مسلمان ہوں اور مسلمان رہوں گی۔ ان لوگوں نے کبھی میرا مذہب تبدیل کرانے کی کوشش نہیں کی۔''

ڈاکٹر زرینہ فضل بھائی مارچ ۱۹۹۹ میں انتقال کر گئیں۔

صفیہ خان، جنھوں نے بمبئی یونیورسٹی سے گریجویشن کیا تھا اور انگلستان سے انگریزی زبان میں ڈپلوما حاصل کیا تھا، زرینہ فضل بھائی کی دوست تھیں۔ وہ کراچی کے مانے ہوئے نیو ٹاؤن گرلز سیکنڈری اسکول کے بانیوں میں شامل اور اس کی پرنسپل تھیں۔ جب ان کا اسکول قومیا لیا گیا تو انھوں نے وہاں کام کرنا چھوڑ دیا اور میری ایڈیلیڈ لیپرسی سینٹر کی ٹیم میں شامل ہو گئیں۔ وہ مختلف اسکولوں میں جا جا کر سلائیڈ شو اور تقریریں کرنے لگیں اور یہ انھی کا خیال تھا کہ اسکول کے بچے ''ماچسوں کے مقابلے'' کے ذریعے اسپتال کے لیے چندہ جمع کریں۔ صفیہ خان ۱۹۸۴ میں وفات پانے تک انتھک ولولے کے ساتھ کام کرتی رہیں۔

ڈاکٹر زرینہ اور صفیہ خان کی وراثت آنے والے برسوں میں آگے بڑھتی گئی اور بہت سی کامیاب پاکستانی خواتین میری ایڈیلیڈ لیپرسی سینٹر کی مدد کے لیے آگے آتی رہیں، نہ صرف جذام کے انسداد بلکہ ٹی بی اور نابیناپن کے انسداد کے لیے بھی۔ پروفیسر رابعہ حسین جیسی سائنسدان، ڈاکٹر برناڈیٹ ڈین جیسی ماہرِ تعلیم، غزالہ احمد جیسی میڈیا منیجر اور شیریں

رحمت اللہ جیسی تجربہ کار سماجی کارکن اس کی مجلس عاملہ کی رکن ہیں۔

۱۹۶۶ میں جب روتھ دوسری بار سوات کے دورے پر گئیں، تو ان کے ساتھ بیلجیم سے تعلق رکھنے والی گول مٹول، سدا مسکراتی نرس ژنین گیوبز بھی تھیں۔ انھوں نے ۱۹۶۲ میں ٹیم میں شمولیت اختیار کی تھی، یعنی اسی سال جب زرینہ فضل بھائی ٹیم کا حصہ بنیں۔ ۱۹۶۳ میں جب اسپتال اپنی نئی عمارت میں منتقل ہوا تو ژنین کو اس کی پہلی میٹرن بنایا گیا۔ انھوں نے اسپتال میں نرسنگ سروسز کی تنظیم کی۔ اسپتال کے نئی عمارت میں آنے کے دوسرے ہی دن ایک صاحب نئے اسپتال کو دیکھنے چلے آئے۔ ژنین نے انھیں اسپتال گھمانے کی پیشکش کی۔ وارڈوں کا معائنہ کرتے ہوئے اس نوجوان پارسی جنٹلمین خرسیگارا نے اچانک رک کر پوچھا، ''مگر بیڈ کہاں ہیں؟'' انھیں سادہ سا جواب ملا، ''ہم نے ابھی اتنے آگے تک نہیں سوچا ہے۔'' اگلے دن بارہ بالکل نئے بیڈ ان صاحب کی طرف سے عطیے کے طور پر اسپتال پہنچ گئے۔

۱۰

غار کا اندھیرا

راولپنڈی سے بذریعہ سڑک سوات جاتے ہوئے روتھ اور ژنین کی نظر ایک بورڈ پر پڑی جس پر لکھا تھا: ''ڈائرکٹر ہیلتھ سروسز، آزاد کشمیر و شمالی علاقہ جات۔'' وہ اس نیٹ ورک کو دیکھنے کے تجسس میں گاڑی سے اتر کر اندر چلی گئیں۔ ڈائرکٹر این یو احمد ایک جنٹلمین ثابت ہوئے۔ جب معلوم ہوا کہ پورے آزاد کشمیر اور شمالی علاقوں کی ڈسپنسریوں میں ان کے پاس پیرامیڈیکل کارکنوں کا عملہ موجود ہے، تو دونوں خواتین نے ان کارکنوں کو جذام کے علاج میں تربیت دینے کی پیشکش کی کیونکہ انھوں نے ان علاقوں سے جذام کے بہت سے مریضوں کو علاج کے لیے کراچی آتے ہوئے دیکھا تھا۔ این یو احمد نے یہ پیشکش قبول کر لی۔ آٹھ کارکنوں کو لیپرسی ٹیکنیشن کے اگلے تربیتی کورس میں شامل ہونے کے لیے کراچی بھیجا گیا۔ ان آٹھ میں دو کشمیری نوجوان محمد اشرف اور سید تصدق حسین گیلانی بھی شامل تھے۔ یہ ایک این جی او — میری ایڈیلیڈ لیپرسی سینٹر — اور گورنمنٹ ہیلتھ سروسز کے درمیان ایک منفرد شراکت کی ابتدا تھی، جس کے اخراجات جی ایل آر اے، میسیریور اور عالمی ادارۂ صحت نے فراہم کیے۔

جب روتھ اور ژنین نے ۱۹۷۹ میں آزاد کشمیر کا دورہ کیا تو محمد اشرف اور سید تصدق، دونوں سرکاری پیرامیڈیکل کارکن جنھوں نے میری ایڈیلیڈ لیپرسی سینٹر میں تربیت پائی تھی، ان کی رہنمائی کے لیے موجود تھے۔

عباس پور کے نزدیک وہ ایک تنگ پہاڑی راستے پر سفر کر رہے تھے۔ اچانک گھاس سے ڈھکی ایک گگر پر روتھ کا پاؤں رپٹ گیا۔ وہ پھسل کر ایک سنگلاخ چٹان پر جا گریں اور ان کی پنڈلی میں موچ آ گئی۔ وہ دونوں فوراً روتھ کو سہارا دینے کے لیے بڑھے۔ سنبھل کر کھڑے ہوتے ہوئے ان کی نظر ایک دم اس شخص پر پڑی۔ غار سے باہر جھانکتے اس کے گلتے ہوئے چہرے میں اس کی آنکھیں حیرانی سے چمک کر پھیل گئی تھیں۔ حیرت کا سامنا حیرت سے ہوا۔ روتھ اپنی سوجی ہوئی پنڈلی کی تکلیف کو بھول کر، اشرف کے سہارے غار میں چلی گئیں۔ وہ لیپر ومیٹس کا مریض تھا اور تیز بخار میں مبتلا تھا۔ اس کے سر میں جوئیں پڑی ہوئی تھیں، بال دھول سے اٹ کر جٹائیں بن گئے تھے اور کپڑے لیر لیر تھے۔ اس نے بتایا کہ جذام کے مرض میں مبتلا ہونے کی وجہ سے اس کے گھر والوں نے اسے نکال دیا ہے۔

بخار اور بدن کی خشکی کے باعث وہ اتنا کمزور ہو گیا تھا کہ چل نہیں پا رہا تھا۔ اشرف اور تصدق پاس کے گاؤں سے ایک چارپائی مانگ کر لائے اور اسے جیپ میں سوار کیا۔ عباس پور کے جذام کے کلینک میں ژنین نے اپنی نرسنگ کی مہارت سے کام لیتے ہوئے، لڑکوں کی مدد سے اسے نہلایا۔ پھر وہ اسے راولپنڈی لائے اور وہاں کے جذام کے اسپتال میں اسے داخل کرایا۔ اس اسپتال کو ایک اور این جی او ''ایڈ ٹو لیپرسی پیشنٹس'' (ALP) چلاتی تھی جو پنجاب اور شمال مغربی سرحدی صوبے کے ہزارہ ڈویژن میں جذام کے مرض کے خلاف کام کر رہی تھی اور جس کا انتظام خدمت کے جذبے سے سرشار جرمن رضاکاروں

کے ایک گروپ کے ہاتھوں میں تھا۔اب اس این جی او کا میری ایڈیلیڈ لیپرسی سینٹر کے ساتھ قریبی تعاون شروع ہو چکا تھا۔

راولپنڈی جاتے ہوئے انھیں پتہ چلا کہ جذام کا یہ مریض ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتا ہے جس کے سات افراد میں جذام کی ابتدائی علامات پائی گئی ہیں، جس سے کسی چھوت کے مریض کی موجودگی کی تصدیق ہوتی تھی۔ خاندان کے تمام افراد کا معائنہ کیا گیا، سوائے باپ کے جس کے بارے میں گھر والوں نے کہا کہ ''وہ بکریاں چرانے اوپر پہاڑوں میں گیا ہوا ہے۔''

راولپنڈی میں علاج کے بعد صحت یاب ہو کر وہ اپنے خاندان سے جاملا۔

ایسا ہی ایک واقعہ ۱۹۸۰ میں شمالی علاقوں میں پیش آیا جب وہ گلگت سے کچھ دور واقع دیہات کا سروے کر رہی تھیں۔ ایک گاؤں میں ٹیم کو احساس ہوا کہ گاؤں والے ان سے پوری طرح تعاون نہیں کر رہے ہیں۔ ایک پہاڑی راستے پر چڑھتے ہوئے انھوں نے ایک لڑکے سے پوچھا کہ کیا گاؤں میں جذام کا کوئی مریض موجود ہے۔ اس نے اوپر پہاڑوں میں ایک غار کی طرف اشارہ کیا۔ وہ ایک سخت چڑھائی کے بعد ہانپتے ہوئے وہاں پہنچے۔ غار کے داخلے پر پتھروں کی ایک دیوار کھڑی تھی۔ لڑکے نے سرگوشی میں بتایا تھا کہ اندر ایک لڑکی بند ہے۔ گلگت سے تعلق رکھنے والے پیرامیڈیکل کارکن عبداللہ نے اوپر چڑھنے میں روتھ کی مدد کی۔ روتھ نے اندھیرے غار میں آواز دی۔ ان کی پکار کا کوئی جواب نہ آیا۔ انھوں نے دیوار کے سوراخ میں سے اپنا ہاتھ غار میں داخل کیا۔ ایک نرم ہاتھ نے ان کے ہاتھ کو سختی سے جکڑ لیا۔ وہ آہستہ آہستہ سرک کر غار میں گھس گئیں۔ اندر سیلن اور اندھیرا تھا۔ انسانی فضلے کی بدبو ان کی ناک میں آئی۔ تب نیم تاریکی میں انھیں لڑکی کے سوکھے ہوئے بدن کی شبیہ دکھائی دی۔ ادینہ کی عمر بمشکل چودہ برس کی تھی۔ وہ چیتھڑوں میں

لپٹی وہاں کھڑی ٹھنڈ اور شاید خوف سے کانپ رہی تھی۔ ڈاکٹر روتھ نے اپنا ڈھیلا ڈھالا جبہ اتار کر فوراً اسے پہنا دیا تاکہ وہ سردی سے بچ جائے اور خوف کی کیفیت سے نکل آئے۔ محبت اور مسیحائی کی متلاشی آنسو بھری آنکھیں لیے وہ لڑکی فرطِ جذبات میں ان کے بازوؤں میں سمٹ گئی۔ اس کے غلیظ چیتھڑوں میں سے جذام کے چکتے دکھائی دے رہے تھے۔ لڑکوں نے اسے سہارا دے کر غار سے باہر نکالا۔

لیکن لڑکی کے گھر والوں نے اسے واپس لینے سے انکار کر دیا۔ وہ یہ ماننے کو تیار نہ تھے کہ جذام کا دواؤں سے علاج ہو سکتا ہے۔ اس تمام محنت سے تھکے ہوئے عبداللہ نے اپنا فیصلہ سنایا۔ وہ لڑکی کو اپنے ساتھ لے جائے گا۔ ''لیکن کہاں؟'' روتھ نے حیران ہو کر پوچھا۔ ''میرے گھر میں سات لوگ ہیں۔ ایک اور کے آنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا،'' اس نے عزم کے ساتھ جواب دیا۔

موثر علاج کے نتیجے میں صحت یاب ہونے کے بعد ادینہ نے عبداللہ کے چھوٹے بھائی سے شادی کر لی۔ اب وہ چار صحت مند بچوں کی خوش و خرم ماں ہے۔

چند سال بعد جب روتھ کو عبداللہ کی اچانک موت کی اطلاع ملی تو وہ اپنے آنسو نہ روک پائیں۔ یہ آنسو سرکاری محکمۂ صحت میں اپنے ایک ساتھی کارکن اور اپنے ایک بیش بہا دوست کی موت پر نکلے تھے۔ انھیں وہ دن یاد آیا جب عبداللہ لیپرسی ٹیکنیشن کے طور پر تربیت پانے کراچی آیا تھا، پھر شمالی علاقوں میں اس کے ساتھ کیے ہوئے گرمجوش فیلڈ ٹرپ یاد آئے، اور بلاشبہ جاڑوں کی برفباری شروع ہونے سے ذرا پہلے ادینہ کا ملنا یاد آیا۔

ادینہ کی کہانی پر بعد میں پی ٹی وی نے ایک ڈرامہ تیار کیا جس میں ادینہ کا کردار نامور اداکارہ روحی بانو نے ادا کیا۔ روحی بانو نے اس ڈرامے میں اپنے کردار کو اپنے پورے ایکٹنگ کیریئر کا یادگار ترین کردار قرار دیا۔

اگر ادینہ نے اپنے بچپن کے دو قیمتی سال پاکستان کے کوہِ ہندوکش کے ایک اندھیرے غار میں گزارے تھے تو دوسری طرف ذکیہ کو افغانستان میں اتنی ہی، بلکہ اس سے بھی کہیں بڑی بدقسمتی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ روتھ ہی نے ذکیہ کو بھی اس کی طویل مصیبت زدہ حالت سے باہر نکالا۔ روتھ، جو انسانی مصائب کے خلاف کام کرنے کے مقصد سے پاکستان آئی تھیں، پہلی بار ۱۹۸۳ میں اسی مشن پر ہمسایہ ملک افغانستان پہنچی تھیں۔

۱۹۷۹ میں افغانستان پر سوویت یونین کے حملے کے بعد افغان مہاجرین کی ایک بڑی تعداد نے پاکستان میں پناہ لی تھی۔ ان میں سے بہت سوں میں جذام کے مرض کی پیش رفت کی واضح علامات پائی جاتی تھیں۔ یہ اس بات کی خاصی بڑی شہادت تھی کہ اس جنگ زدہ ملک میں یہ بیماری بہت پھیلی ہوئی ہے۔ مجاہدین کے ایک گروپ نے روتھ سے درخواست کی تھی کہ اس مرض کے منبعے تک پہنچ کر اس کی روک تھام کی تدبیر کریں۔ روتھ نے اس سلسلے میں دو افغانوں، حسن اور مبارک، سے مشورہ کیا جو کراچی میں علاج کے بعد جذام کے مرض سے صحت یاب ہو کر لیپرسی ٹیکنیشن کے طور پر تربیت حاصل کر چکے تھے۔ روتھ کو جذام سے متعلق حکومت پاکستان کا وفاقی مشیر مقرر کر دیا گیا تھا۔ اس حیثیت سے انھوں نے صدر سے ملاقات کی اور افغانستان کے دورے کی اجازت طلب کی۔ صدر جنرل ضیاء الحق نے انھیں اجازت دے دی۔

روتھ نے زرد رنگ کا برقع اوڑھا اور سرخ رنگ کی ٹویوٹا لینڈ کروزر میں سوار ہو گئیں جسے ایک افغان مجاہد چلا رہا تھا۔ وہ رات کے اندھیرے میں کوئٹہ شہر کی سڑکوں سے گزر کر پو پھٹے سرحد پار کر کے افغانستان میں داخل ہو گئے۔ بنجر پہاڑی راستوں پر دو دن متواتر سفر کے بعد، راستے میں چینکیں بھر بھر کر قہوہ پیتے اور درختوں سے خوبانیاں توڑ کر کھاتے ہوئے، وہ مرکزی افغانستان میں ہزارہ جات کے علاقے میں پہنچے جس پر مجاہدین کا قبضہ

تھا۔

آس پاس کے دیہات کے سروے کے دوران ان کی ملاقات ایک شخص سے ہوئی جس نے کراچی میں جذام کا کامیاب علاج کروایا تھا۔اس نے بتایا کہ ایک لڑکی جسے جذام میں مبتلا ہونے کے بعد اس کے والدین نے مردہ مشہور کر دیا ہے، اس کے شک کے مطابق زندہ ہے اور اسے گاؤں میں کسی جگہ چھپا دیا گیا ہے۔اس نے پہاڑی کے اوپر بنے ہوئے ایک مکان کی جانب اشارہ کیا۔ٹیم پہاڑ پر چڑھ کر پتھروں کے بنے اس مکان تک پہنچی۔ لڑکی کی ماں میں جذام کے مرض کی ابتدائی علامات دکھائی دیں۔انھوں نے اس سے بیٹی کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے انھیں وہی جواب دیا کہ وہ مر چکی ہے۔

لیپرسی ٹکنیشین مبارک نے مکان کے ارد گرد چکر لگایا اور مویشیوں کے چھوٹے سے باڑے میں جھانکا۔لڑکی وہاں ایک کونے میں دبکی ہوئی تھی۔مبارک نے دہشت زدہ ہو کر روتھ کو آواز دی۔انھوں نے ہچکچاتے ہوئے باڑے میں قدم رکھا۔اندر اندھیرا اور تعفن پھیلا ہوا تھا۔وہ قریب سے دیکھنے کے ارادے سے آگے بڑھیں۔وہ میکلوڈ روڈ کے بدہیئت گداگروں کے درمیان ایک پوری عمر گزار آئی تھیں لیکن افغانستان میں بہت اندر جا کر واقع اس مویشیوں کے باڑے میں انھیں جو مسخ شدہ انسانی چہرہ دکھائی دیا، ویسا چہرہ دیکھنے کی انھوں نے کبھی توقع نہیں کی تھی۔اور یہ چہرہ ایک چھبیس سالہ عورت کا تھا۔ذکیہ کی سوجی ہوئی سرخ آنکھیں اپنے حلقوں سے باہر ابل آئی تھیں۔اس کی ناک پوری گل کر جھڑ چکی تھی۔منہ ٹیڑھا ہو گیا تھا اور اس میں سے رال بہہ رہی تھی۔اس کی آواز تک مرض کے باعث بگڑ کر بھاری سرگوشی میں بدل گئی تھی۔جب مبارک نے اسے سمجھایا کہ وہ لوگ اس کا علاج کرنے آئے ہیں تو اس نے دوا مبارک کے چہرے پر دے ماری اور کہا، ''تم لوگ اب آئے ہو جب...'' مبارک کو اسے فارسی میں سمجھانے میں پورا ایک گھنٹہ لگا کہ علاج شروع کرنا

بہت ضروری ہے۔ آخرکار وہ اسے باڑے سے باہر نکال لائے لیکن اب اس کی ماں ان کے راستے میں دیوار بن کر کھڑی ہو گئی۔ ہرگز نہیں! اس کی اور بھی بیٹیاں ہیں جن کی شادی ہونی ہے۔ اگر اس نے کوڑھ سے مسخ شدہ اس لڑکی کو اپنے گھر میں آنے دیا تو اس کی بیٹیوں کو کوئی رشتہ نہیں دے گا۔ اب صرف ایک ہی راستہ تھا کہ ذکیہ کو برقعے میں لپیٹ کر کراچی لے آیا جائے۔ اس کے باوجود اس کے جسم سے اٹھتا تعفن اتنا شدید تھا کہ ڈرائیور اس وقت تک گاڑی چلانے پر آمادہ نہ ہوا جب تک وہ گاڑی کے سب سے دور والے کونے پر سامان کے پاس نہ جا بیٹھی۔

اسپتال میں داخل ہونے کے بعد وہ روتھ کے سوا کسی کو اپنے پاس نہ پھٹکنے دیتی تھی۔ جب سینئر نرس رضیہ نے اسے سمجھایا کہ وہ بھی ذکیہ کی طرح شیعہ مسلمان ہے تو کہیں جا کر اس نے اسے خود کو نہلانے اور بال سنوارنے کی اجازت دی۔ رضیہ کو اس کے ناخن کاٹنے کی ضرورت نہ پڑی کیونکہ ناخن پہلے ہی انگلیوں کے ساتھ جھڑ چکے تھے۔ اس کے ہاتھوں اور پیروں کی جگہ صرف ٹھونٹھ رہ گئے تھے۔

دواؤں سے ذکیہ کا انفیکشن چند ماہ کے اندر ٹھیک ہو گیا لیکن پچھلے بیس برس علاج سے غفلت برتنے کے نتیجے میں اس کا جسم جس طرح مسخ ہو چکا تھا اس کی درستی ممکن نہ تھی۔ جب گاؤں والوں کو اس کی موت کی جھوٹی خبر دی گئی تب اس کی عمر صرف چھ سال تھی۔

آسٹریلیا کی ری کنسٹرکٹو سرجن ڈاکٹر گریس وارن، جو ۱۹۶۷ سے میری ایڈیلیڈ لیپرسی سینٹر میں آ کر ہزاروں مریضوں کے آپریشن کر چکی تھیں، ذکیہ کے لیے کچھ زیادہ نہ کر پائیں۔ بیس برس طویل نفسیاتی ابتلا نے ذکیہ پر اپنے گہرے اثرات چھوڑے تھے اور اس پر کسی کسی وقت اچانک جارحیت کا دورہ پڑ جاتا تھا جس میں وہ تکیے اور برتن اٹھا اٹھا کر پھینکنے اور آئینے اور واش بیسن توڑنے لگتی تھی۔

ان دوروں کے درمیانی وقفوں میں ذکیہ کی خوش مزاج طبیعت ابھر آتی اور وہ چوری چھپے باورچی خانے میں جا کر فالتو پھل چرا لاتی اور اسپتال میں چکر لگاتے ہوئے اپنے ساتھی مریضوں کے ساتھ بانٹ کر کھاتی۔ شام کے وقت وہ چھت پر چلی جاتی اور واٹر ٹینک کی چھت سے شہر کی وسعت کا گھنٹوں نظارہ کیا کرتی، یا پھر نیچے آ کر ٹی وی دیکھنے لگتی اور کشتی لڑتے پہلوانوں یا پنجابی عشقیہ گانے گاتی ملکۂ ترنم نور جہاں کو داد دینے کے لیے اپنے ہاتھوں کے ٹھونٹھوں سے تالیاں بجاتی۔

ذکیہ نے منگھوپیر میں اسکول اور کڑھائی کی ورکشاپ کے برابر میں واقع، سسٹر ژنین کے زیر اہتمام چلنے والے میری ایڈیلیڈ لپرسی سینٹر اپاہج خانے میں ۱۹۹۹ میں اپنی زندگی پوری کی۔ سسٹر ژنین اور اسکول کی طالبات اور رضا کار لڑکیاں اکثر اس سے ملنے آتیں اور اس کے لیے تحفے اور پھول لاتیں۔ ان میں سے کئی، مثلاً بیلجیم کی فزیوتھیراپسٹ کیتھلین سویٹن، اس کی قریبی دوست بن گئی تھیں۔
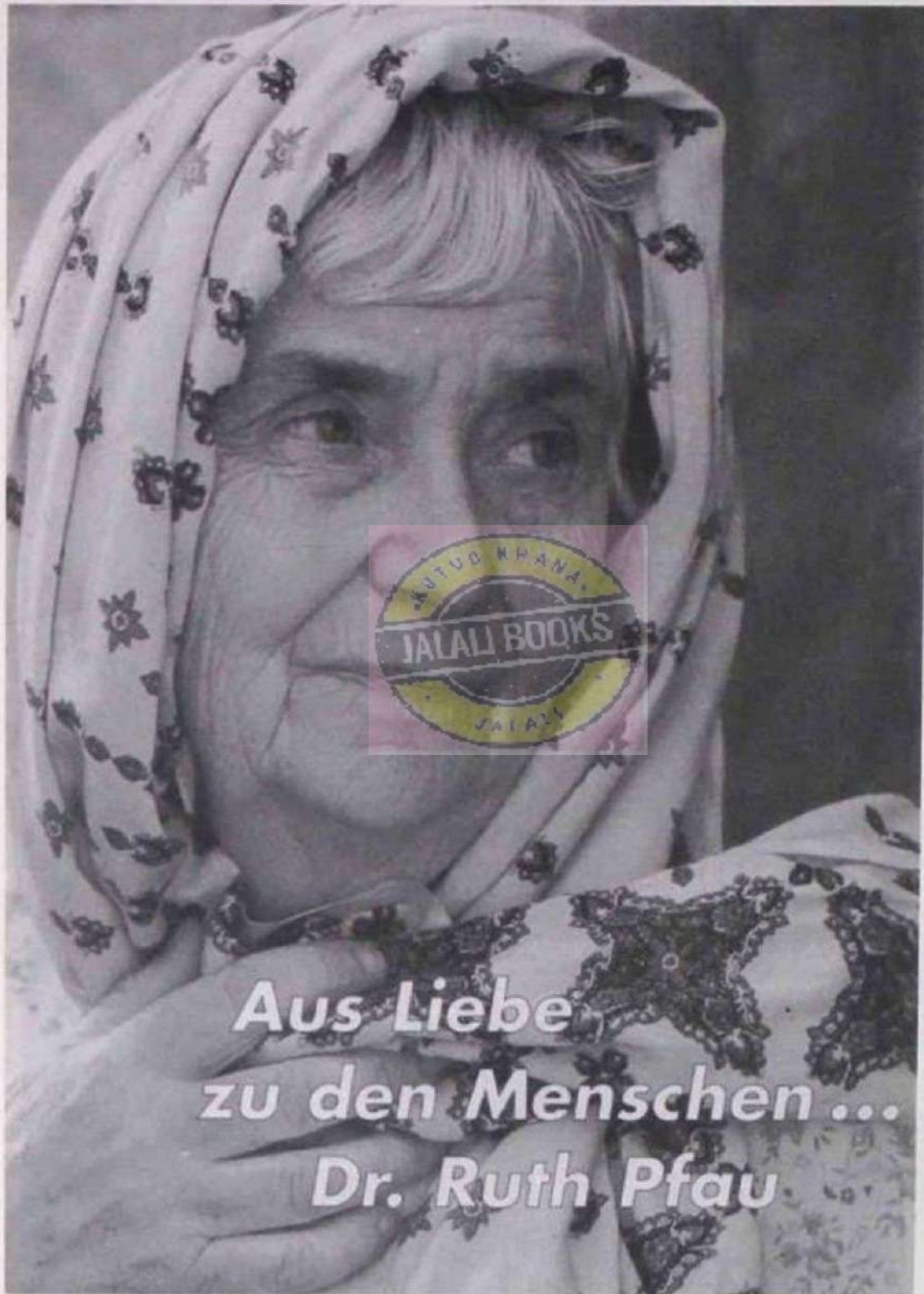
''خاک نشینوں کی محبت سے سرشار...'' ڈاکٹر روتھ فاؤ
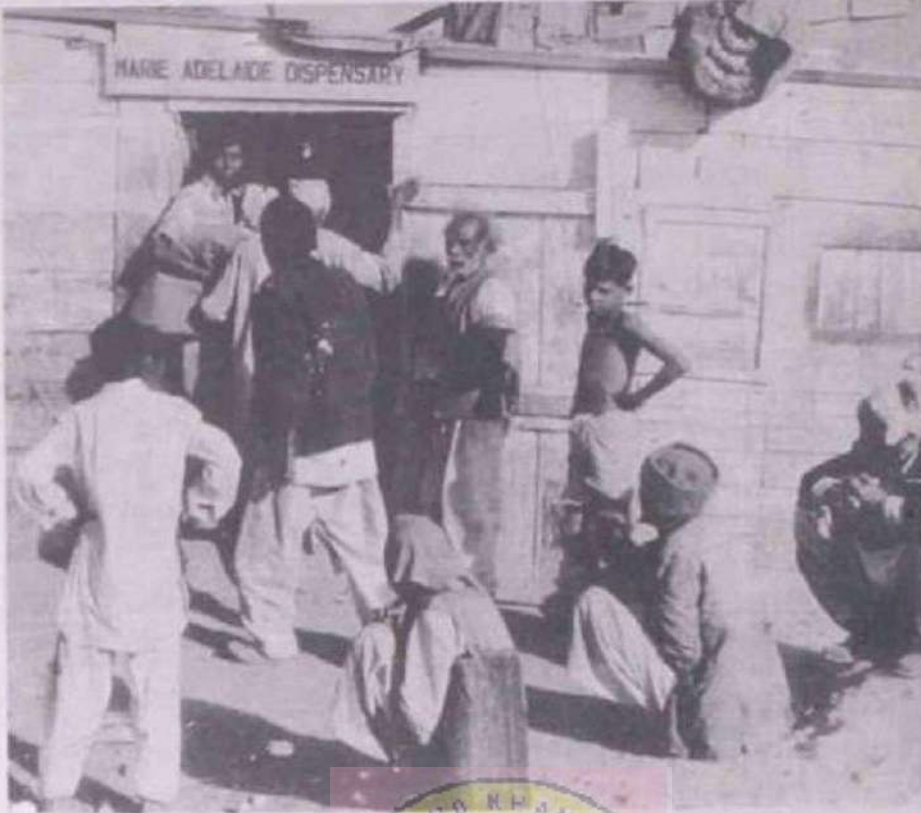
ڈاکٹر روتھ فاؤ

کارڈ بورڈ کی دیواروں سے بنی ڈسپنسری
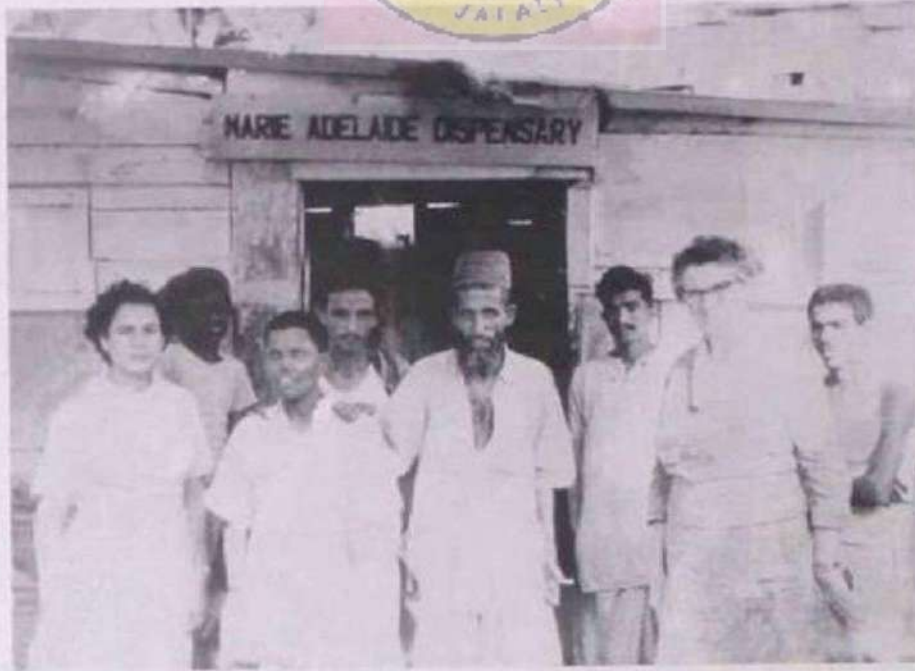
سسٹر برنیس وارگاس اور مدر میری ڈائل میکلوڈ روڈ کی ڈسپنسری کے سامنے

سسٹر برنیس وارگاس جو ڈاکٹر روتھ فاؤ
کو میکلوڈ روڈ کے عقب میں واقع
جذامیوں کی بستی میں لے کر گئیں
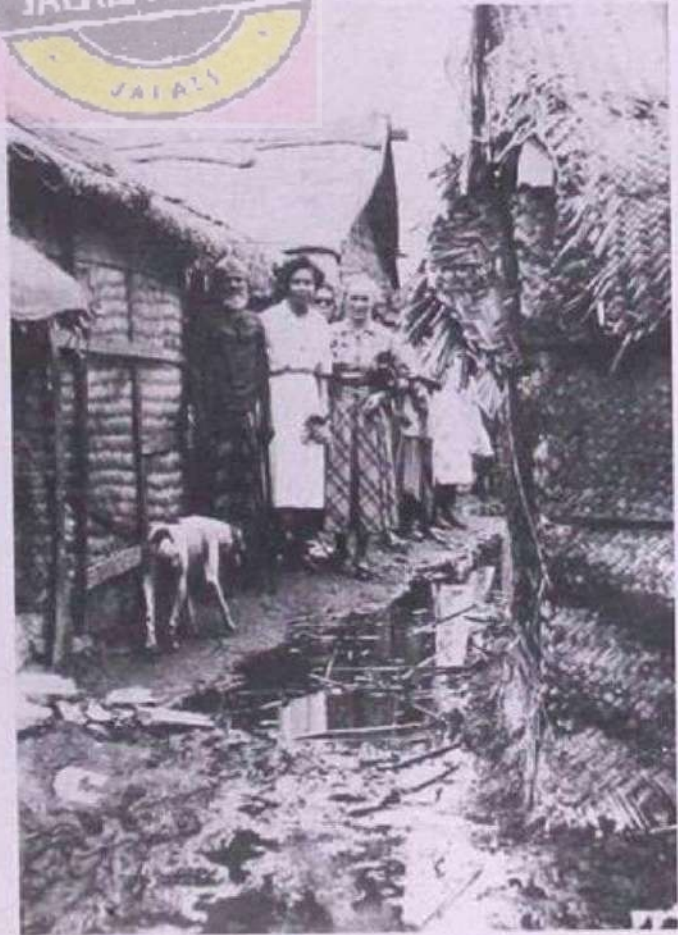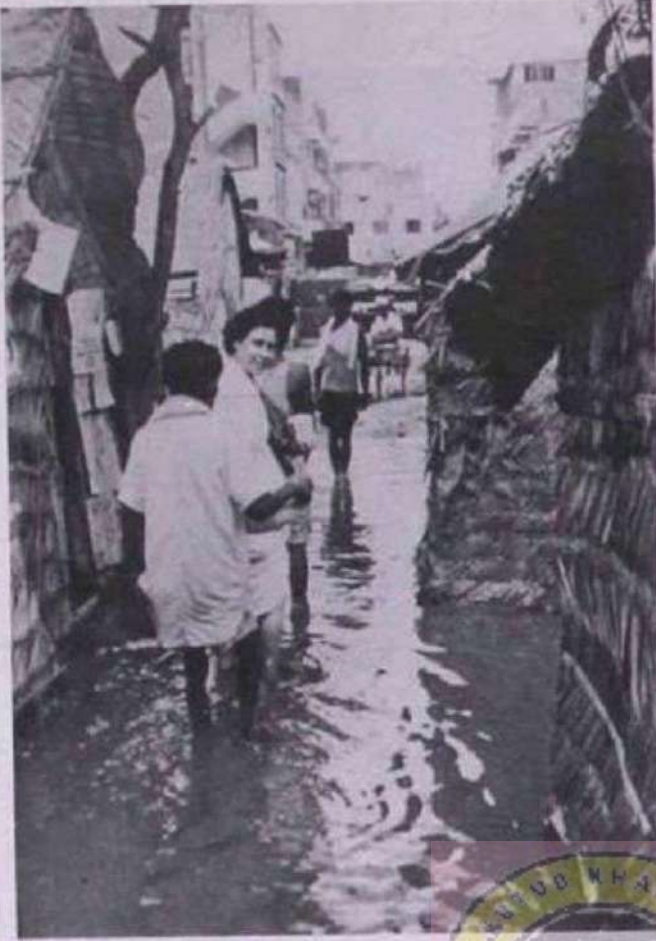
میکلوڈ روڈ کی جذامیوں کی بستی،
سسٹر برنیس وارگاس اور
مدر میری ڈائل کی نظر میں

(دائیں سے بائیں) ڈاکٹر روتھ فاؤ، ژنین گیونز اور میری ڈائل (1965)
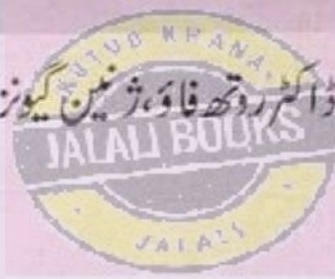
صدر کراچی میں واقع میری ایڈیلیڈ لیپرسی سنٹر کی عمارت

کراچی میں جذام کے اولین شفاخانوں میں سے ایک (فوٹو: ہانس کٹنیوسکی)
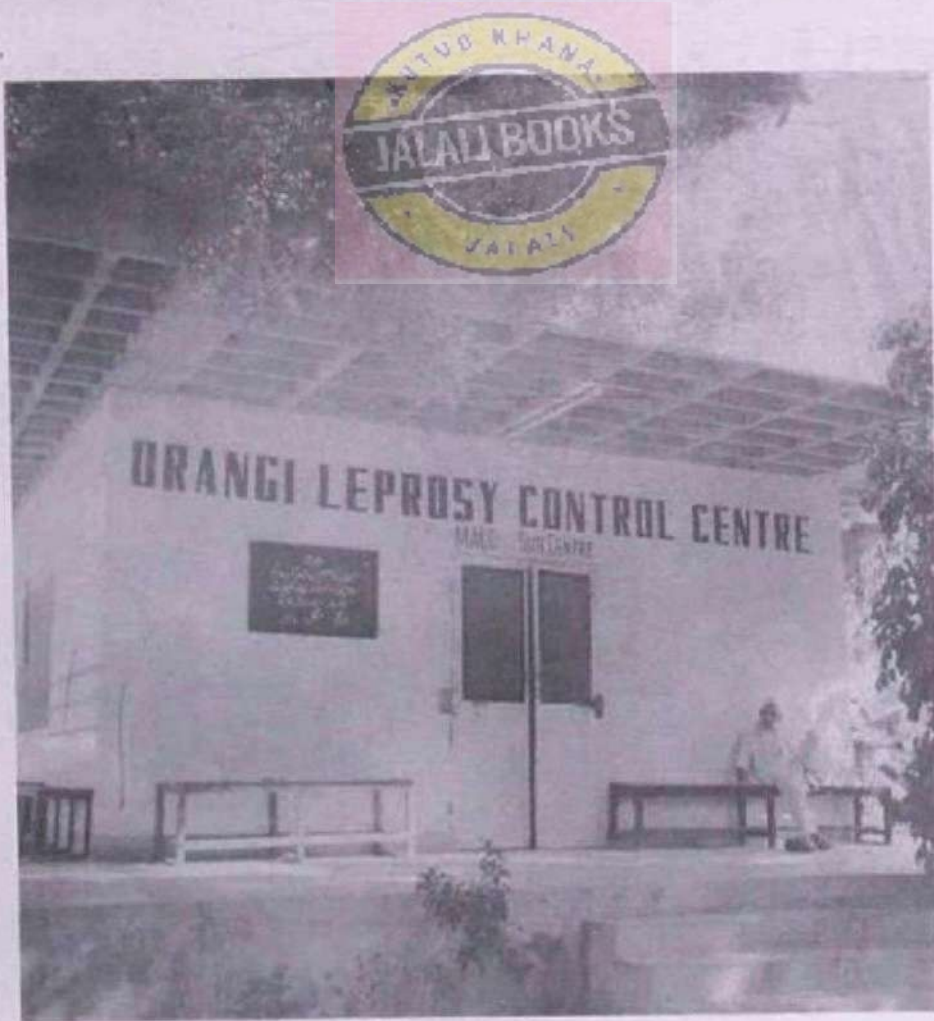
اورنگی کراچی میں واقع ایک ذیلی سنٹر (فوٹو: ہانس کٹنیوسکی)

نوجوان ڈاکٹروں کی تربیت (فوٹو: ہانس کٹینوسکی)

آزاد کشمیر میں سڑک کے کنارے واقع ایک شفاخانہ (فوٹو: ہانس کٹینوسکی)

ایشیا کی سب سے بڑی کچی آبادی اورنگی میں
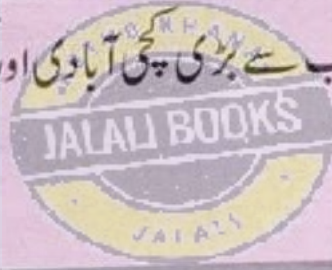
لیپرسی ٹیکنیشین تربیتی کورس کے مکمل ہونے پر

میری ایڈیلیڈ لیپر سی سنٹر میں ایک کمسن مریض کا خیر مقدم کرتے ہوئے (فوٹو: جمشید مسعود)

ایک زیر علاج مریض کے سرہانے (فوٹو: جمشید مسعود)
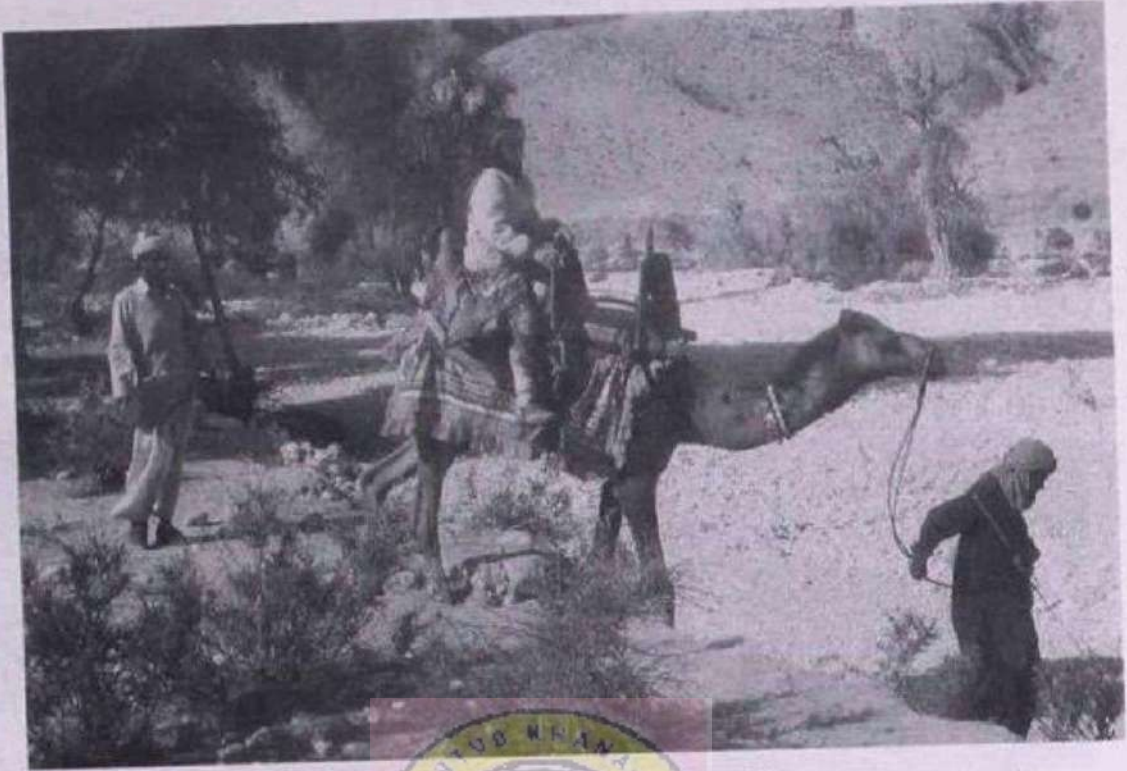
بلوچستان میں اونٹ کی پیٹھ پر سفر کرتے ہوئے (فوٹو: مائیکل ایلبس)
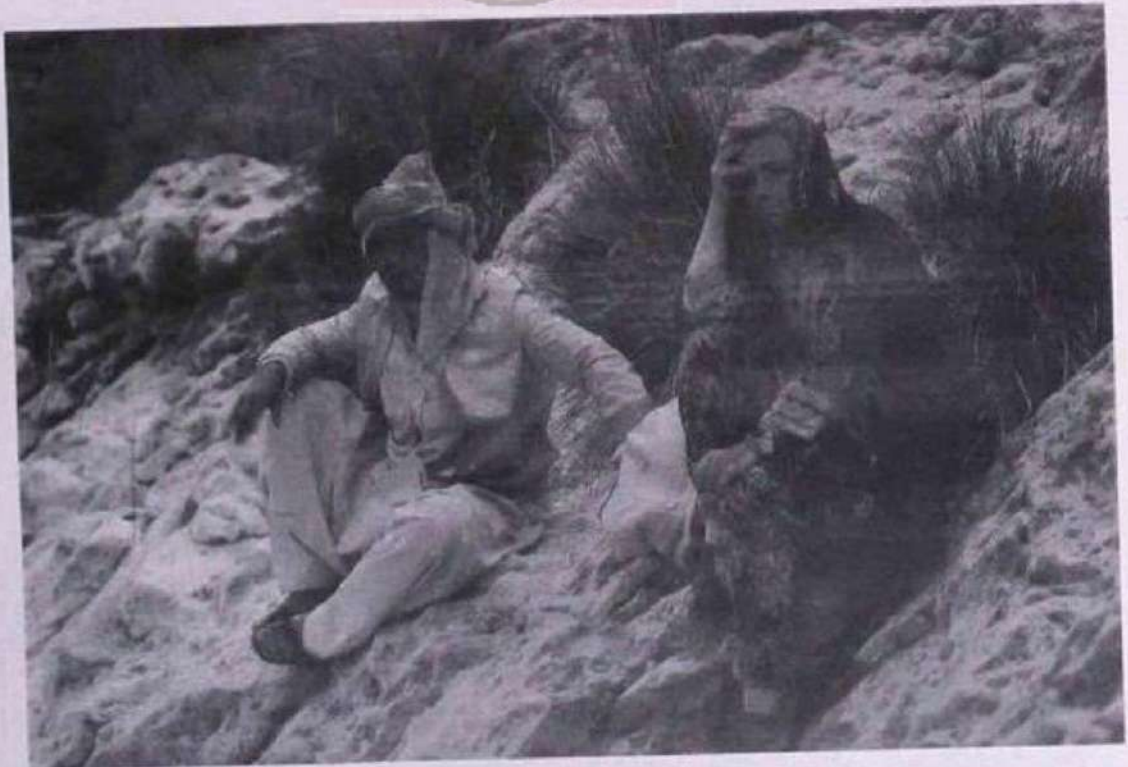
اگلے پہاڑ کی چڑھائی سے پہلے رک کر ستانے کے چند لمحے (فوٹو: مائیکل ایلبس)

گاؤں کے ایک کم عمر بچے کا معائنہ کرتے ہوئے (فوٹو: رالف باورڈک)

ایک معمر دیہاتی مریض کا معائنہ کرتے ہوئے

بلند پہاڑی علاقوں میں
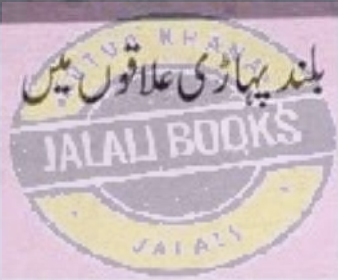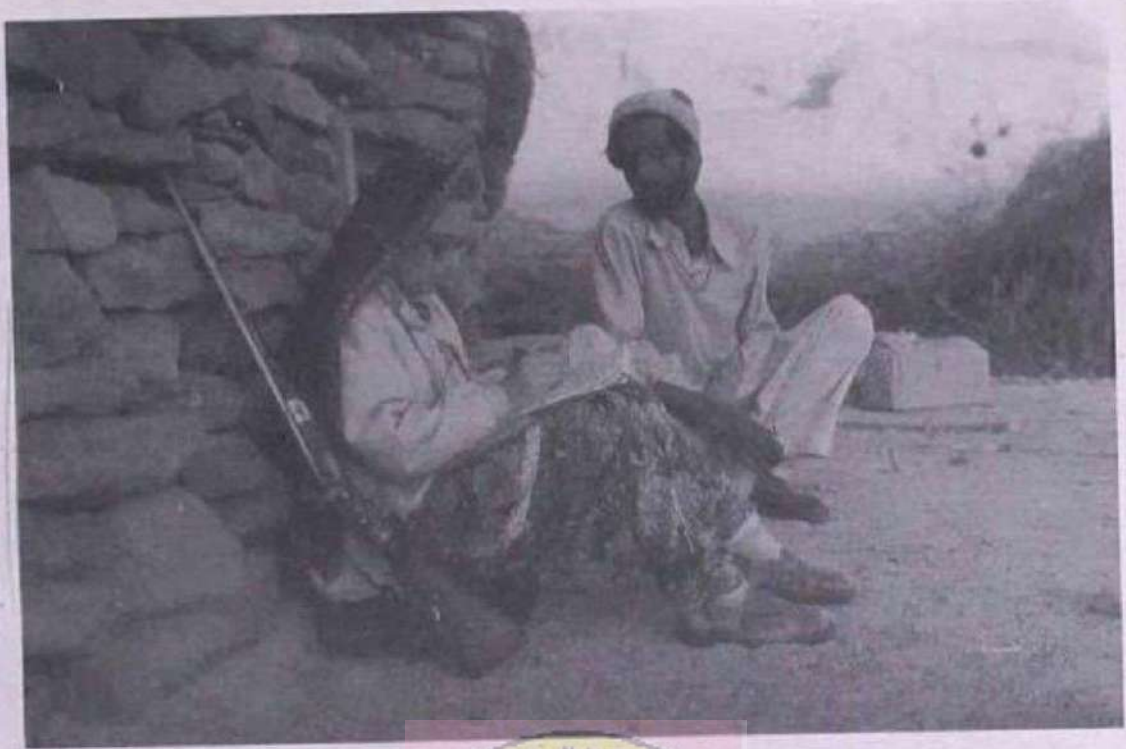
گاؤں کی ایک جھونپڑی میں
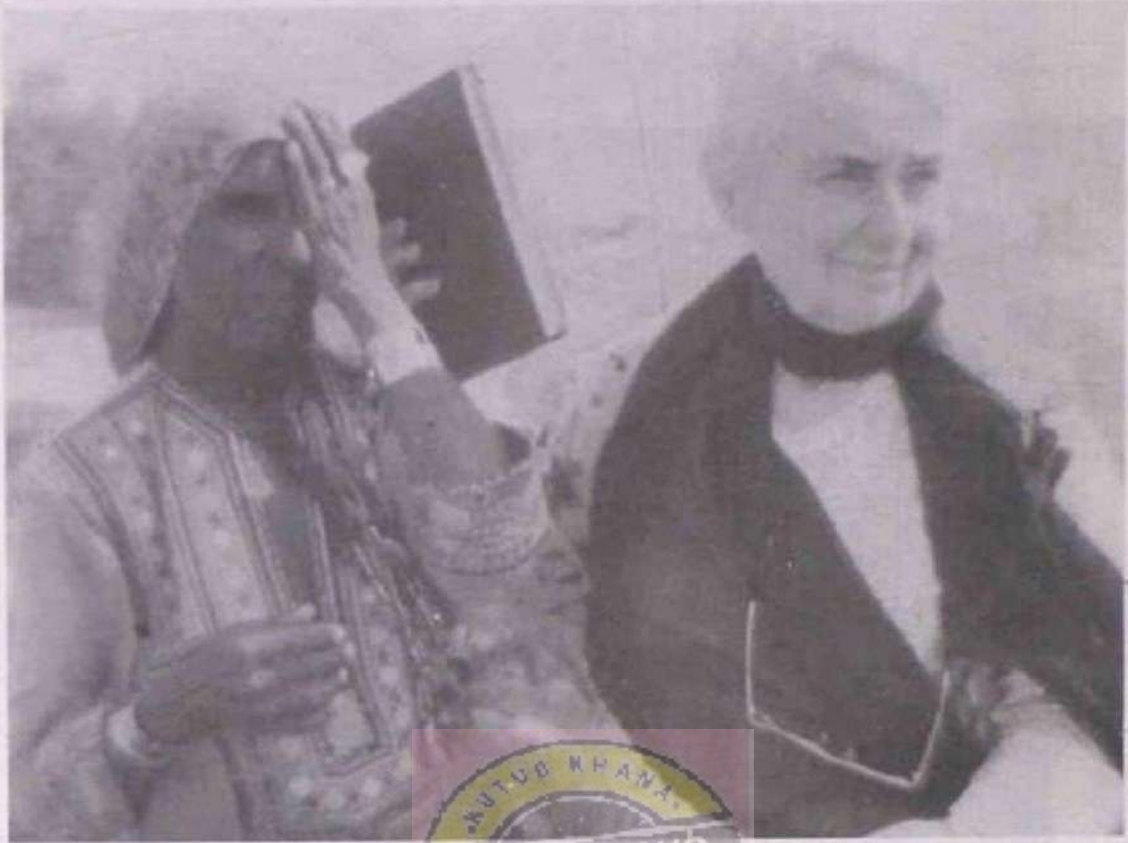
لیپرسی کنٹرول کے بعد نابینا پن کے کنٹرول کا پروگرام

صدر جنرل یحییٰ خان سے
تمغہ وصول کرتے ہوئے
(1969)

صدر جنرل ضیاالحق کے ساتھ
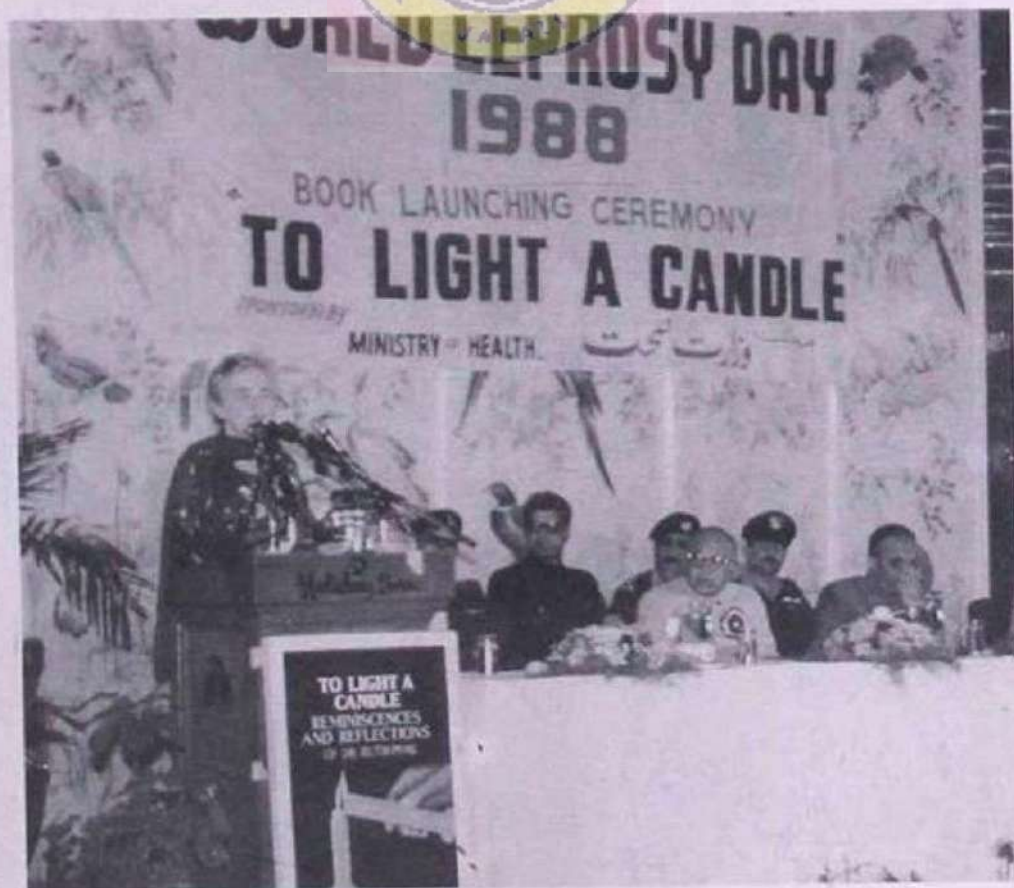
اپنی انگریزی کتاب کی تقریب اجرا کے موقعے پر

جرمنی کے چانسلر ہلمٹ کوہل کے ساتھ
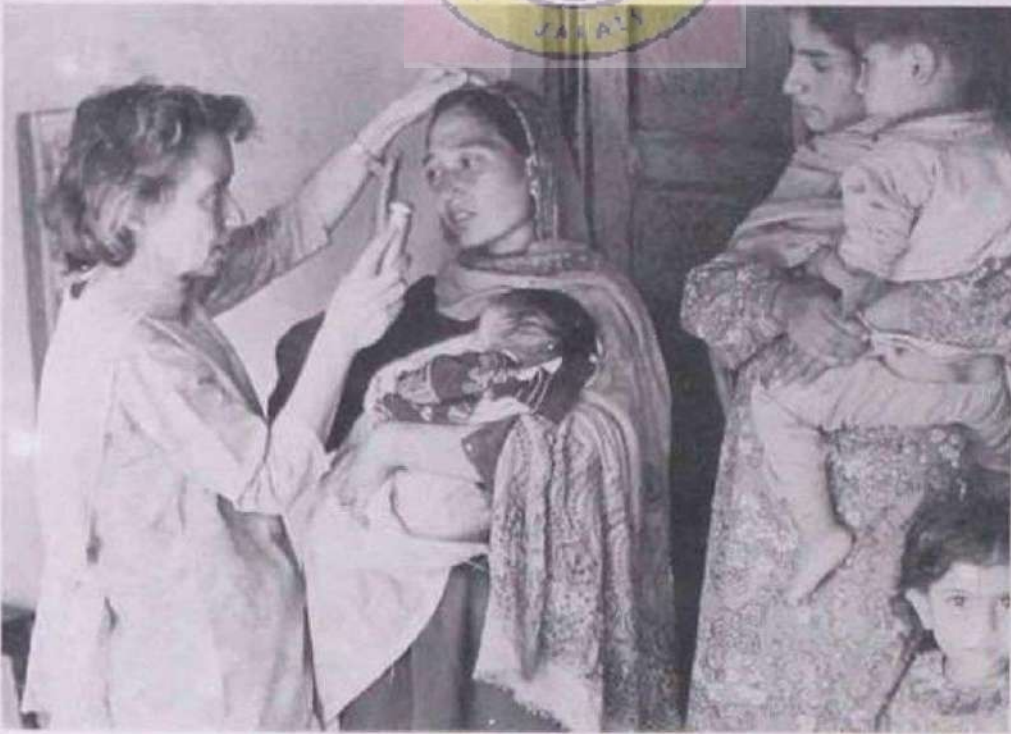
آزاد کشمیر کی وادیِ نیلم میں ایک ماں اور اس کے بچوں کے ساتھ (فوٹو: ہانس کٹینیوسکی)

فلپائن کی صدر گلوریا مکاپگال ارویو سے رامون میگسیسے
ایوارڈ وصول کرتے ہوئے (2002)

فلپائن کے دار الحکومت منیلا میں رامون میگسیسے ایوارڈ
کی تقریب میں پاکستان کی نمائندگی کرتے ہوئے (2002)

جناح سوسائٹی ایوارڈ (2003)
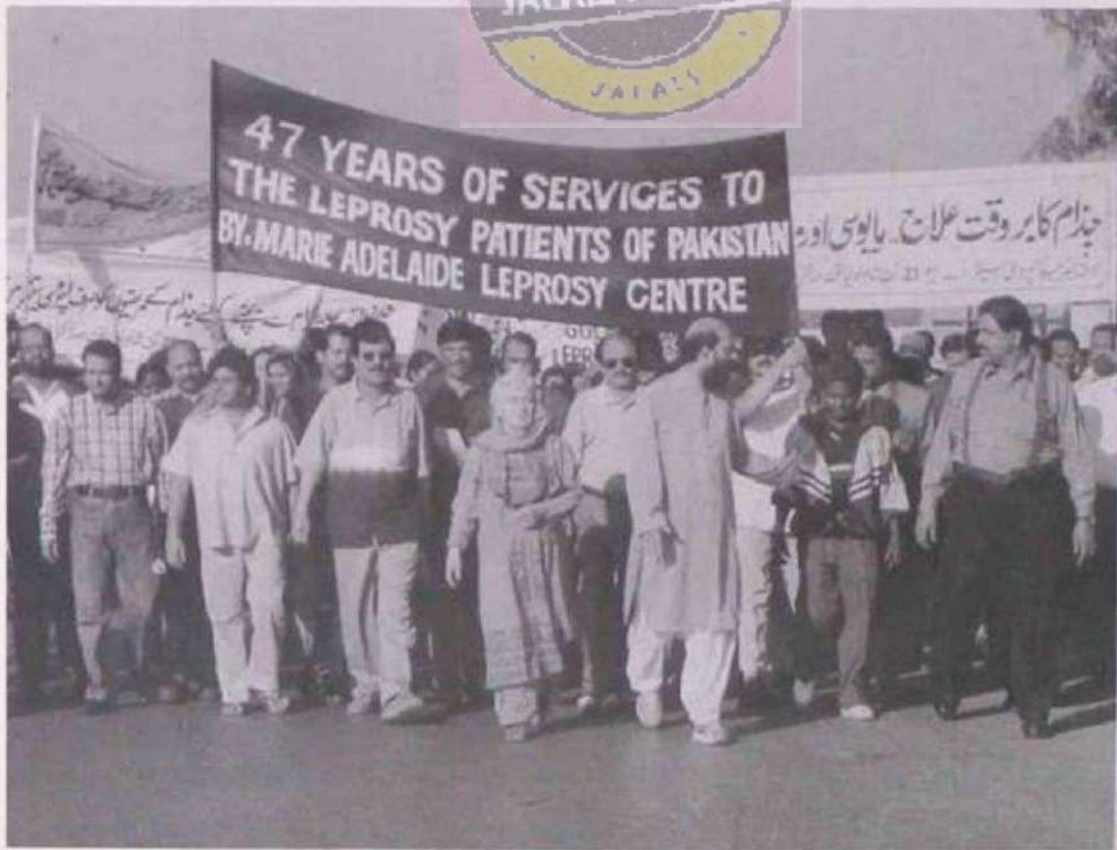
مصور جمی انجینئر کے ساتھ ایک واک کی قیادت کرتے ہوئے
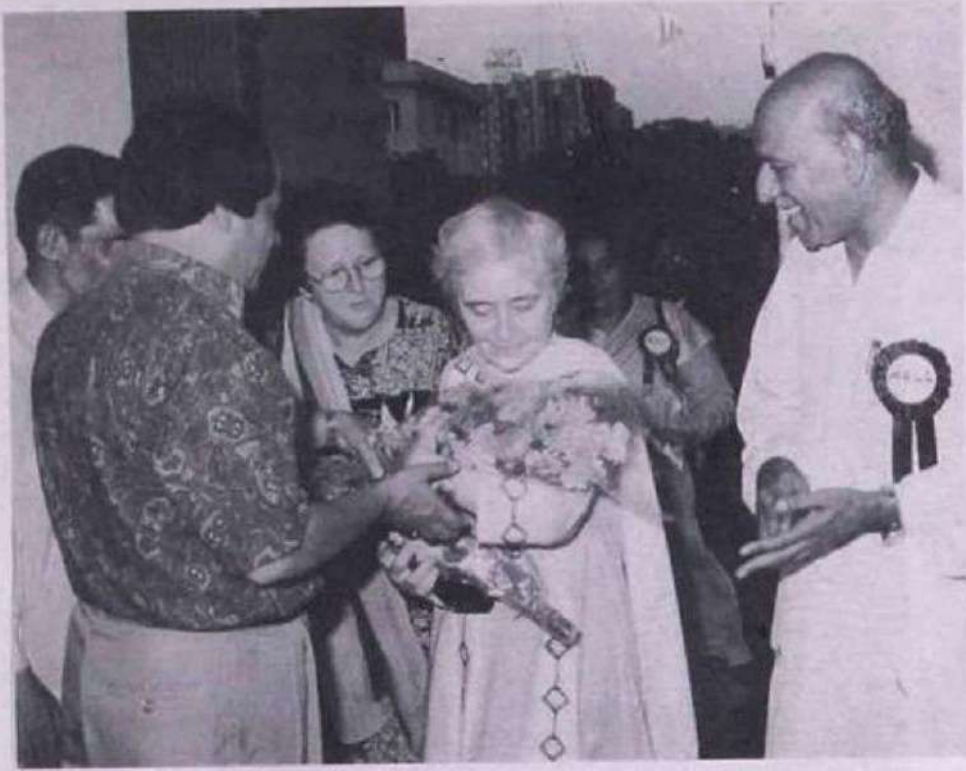
میری ایڈیلیڈ لیپرسی سنٹر کے چیف ایگزیکٹوڈاکٹر اشفاق علی خاں
سے گلدستہ وصول کرتے ہوئے

جرمنی کے سفیر ڈاکٹر کرسٹاف برومر، مسٹر میرن لوبو (ڈائرکٹر ایم اے ایل سی)
اور ڈاکٹر اشفاق (چیف ایگزیکٹو ایم اے ایل سی) کے ساتھ
جذام کے عالمی دن کی تقریب میں آتے ہوئے

شمع روشن کرنا-- مصنف مطہر ضیا
ڈاکٹر روتھ فاؤ کے ساتھ
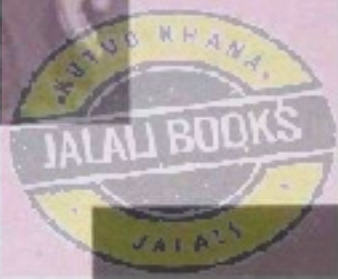
ڈاکٹر روتھ فاؤ
اپنی سترویں سالگرہ کے موقعے پر
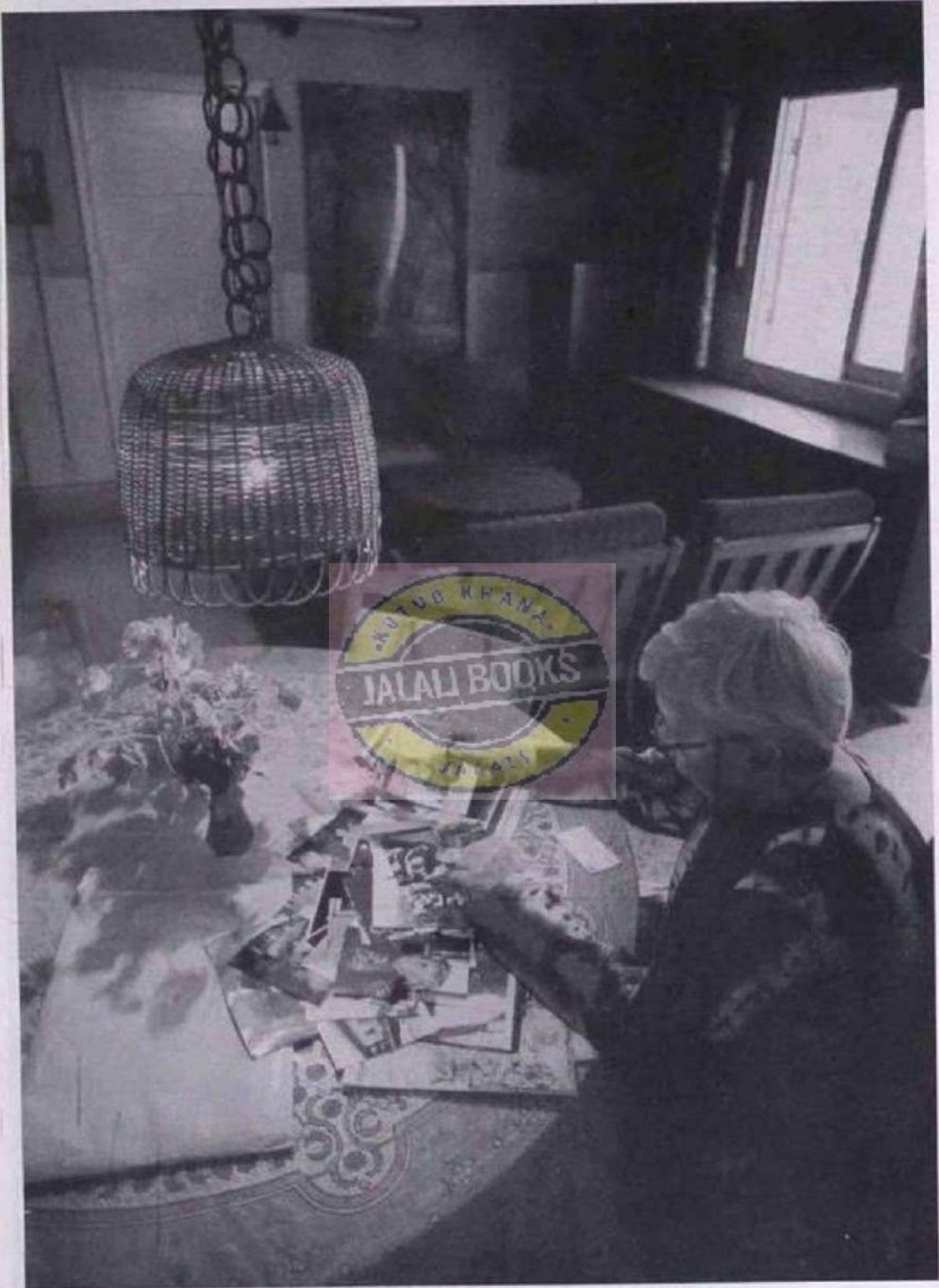
میری ایڈیلیڈ لیپرسی سنٹر کی عمارت میں واقع اپنے فلیٹ میں (فوٹو: جمشید مسعود)

۱۱

خدمت ہو مقصدِ حیات میرا

سنیچر ۱۵ جولائی ۱۹۴۵ کو این فرینک نے اپنی ڈائری میں لکھا تھا:

''میرے لیے اتنے انتشار، کرب اور موت کی بنیاد پر اپنی زندگی تعمیر کرنا قطعی ناممکن ہے۔ میں دنیا کو رفتہ رفتہ ایک ویرانے میں بدلتا ہوا دیکھ رہی ہوں، آنے والے طوفانوں کی گرج سن رہی ہوں جو ایک دن ہم سب کو نیست و نابود کر دے گا۔ مجھے لاکھوں انسانوں کی زندگی کے مصائب محسوس ہوتے ہیں۔ پھر بھی جب میں آسمان کی طرف نگاہ اٹھاتی ہوں تو کسی نہ کسی طرح مجھے احساس ہوتا ہے کہ سب کچھ بہتر ہو جائے گا، کہ یہ سفاکی بھی آخرکار ختم ہو جائے گی، کہ امن اور سکون ایک بار پھر لوٹ آئیں گے۔ اس دوران مجھے اپنے آدرشوں سے مضبوطی سے جڑے رہنا چاہیے۔ شاید ایک دن آئے گا جب میں ان آدرشوں کو حاصل کر پاؤں گی۔''

این فرینک نے جرمنی کے ایک خاندان میں ۱۲ جون ۱۹۲۹ کو، روتھ فاؤسے صرف

تین ماہ پہلے، جنم لیا تھا۔ وہ سولہ برس کی چھوٹی سی عمر میں ایک کنسنٹریشن کیمپ میں چل بسی۔ اس کی لاش، اس کی بہن کی لاش کے ساتھ، ایک اجتماعی قبر میں ڈال دی گئی۔

این فرینک ایک صحافی، ایک لکھاری بننا چاہتی تھی۔ وہ پوری دنیا کا سفر کرنے کا خواب دیکھتی تھی، لیکن وہ اپنا یہ خواب پورا نہ کر سکی۔

اس کے برخلاف روتھ فاؤ موت اور تباہی سے بچ نکلیں۔ آج وہ حکومت پاکستان کی وفاقی مشیر ہیں۔ یہ عہدہ انھیں ۱۹۷۹ میں پیش کیا گیا تھا۔ انھوں نے اسے ہچکچاتے ہوئے قبول کیا، صرف اس غرض سے کہ جذام کے مریضوں اور ان کا علاج کرنے والے پیرامیڈیکل کارکنوں کی آواز اسلام آباد کی افسر شاہی کی راہداریوں تک پہنچ سکے۔

ان کارکنوں کی بات کریں تو یہی وہ نوجوان تھے جو روتھ کی رہنمائی کرتے ہوئے انھیں مکران کے ریگزاروں اور گلگت کے پہاڑوں میں لے گئے تھے۔ انھی نے روتھ کے ساتھ مل کر کراچی میں عائد کرفیو، بلوچستان کے گرج چمک کے طوفان اور اچانک پھوٹ پڑنے والے سیلاب اور آزاد کشمیر کے برفانی تودے کی پروا کیے بغیر خدمت کی اعلیٰ مثال قائم کی۔ سندھ کی تپتی ریت پر سفر، بھوک اور پیاس کی شدت، زہریلے کیڑے مکوڑوں کے احساس کے ساتھ کھلے آسمان تلے راتوں کا قیام، پورے پاکستان میں یہ سفر کا نہیں، تھا نہیں۔

اس جدوجہد نے روتھ کو اپنے کام کا اعتراف اور احترام بخشا۔ وفاقی جمہوریہ جرمنی نے انھیں ۱۹۶۹ میں پہلا اعزاز Bundesverdienstkreuz، ۱۹۷۸ میں دوسرا Grosse Bundesdienstkreuz، ۱۹۸۵ میں تیسرا Grosse Verdienstkreuz mit Stern اور ۱۹۹۴ میں چوتھا Osterreichische Albert Schweitzer-Gesse llschaft عطا کیا۔ پاکستان نے، جسے وہ

پیار سے ''میرے دل کا ملک'' کہتی ہیں، انھیں ۱۴ اگست ۱۹۶۹ کو ستارۂ قائداعظم، ۲۳ مارچ ۱۹۷۸ کو ہلالِ امتیاز، اور ۲۳ مارچ ۱۹۸۹ کو ہلالِ پاکستان کے اعزاز اور پاکستان کی اعزازی شہریت پیش کی۔ ۱۹۹۱ میں امریکہ کی ڈیمین ڈٹن سوسائٹی فار لیپرسی ایڈ نے انھیں ڈیمین ڈٹن ایوارڈ سے نوازا۔ سال ۲۰۰۲ ان کے لیے فلپائن کا رامون میگسیسے ایوارڈ لے کر آیا۔

پاکستان میں کم لوگوں کو علم ہوگا کہ ڈاکٹر روتھ فاؤ پانچ کتابوں کی مصنفہ ہیں، جو سب جرمن زبان میں ہیں۔ ان میں سے پہلی کتاب کا انگریزی ترجمہ ۱۹۸۷ میں To Light a Candle کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔

یہ وہ یادداشتیں ہیں جن کے اصل جرمن روپ کی ایک کاپی ایک خاتون اپنے سینے سے لگائے کھڑی دکھائی دیں جب روتھ نے اپنے آبائی وطن کے ایک سفر کے دوران جوان اور بوڑھے جرمن مردوں اور عورتوں کو آٹوگراف دیتے ہوئے اچانک نظریں اٹھا کر دیکھا۔ خاتون ان کی ہم عمر دکھائی دیتی تھی۔ جب ان کی نظریں ملیں تو وہ ان کے قریب آئی اور پوچھا، ''مجھے پہچانتی ہو؟ ... میں گابی ہوں۔'' ہاں بالکل! وہ ان مسکراتی ہوئی نیلی آنکھوں کو کیسے بھول سکتی تھیں جو ان کے ذہن پر برسوں مسلط رہی تھیں۔ وہی آنکھیں جو اس وقت آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ دونوں سہیلیاں ایک دوسرے کے گلے لگ کر بے ساختہ رو پڑیں۔

بعد میں گابی نے روتھ کو بتایا کہ یہ کتاب ایک بک اسٹور میں اتفاق سے اس کے ہاتھ لگ گئی تھی۔ سرورق پر روتھ کا نام لکھا دیکھ کر وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ اس نے ورق الٹ کر دیکھا تو کھوئے ہوئے بچپن کے تذکرے میں اسے اپنا نام بھی دکھائی دیا۔ پھر گابی نے اپنے خاندان پر پڑنے والی ابتلا کا تذکرہ کیا اور بتایا کہ کس طرح وہ لوگ فرار ہو کر

ہمسایہ ملک بیلجیم پہنچے اور وہاں جنگ کے خاتمے تک روپوش رہے۔

اپنی نئی حاصل کردہ دنیا میں روتھ کو بھی اپنے حصے کی تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ انھیں اپنے سر میں مائیگرین کا جو درد یونیورسٹی کے دنوں سے محسوس ہوتا تھا، اسے انھوں نے کبھی سنجیدگی سے نہیں لیا تھا۔ جب کبھی وہ فیلڈ میں دورے پر ہوتیں تو جیپ کی پچھلی سیٹ یا کسی چارپائی پر آدھ گھنٹہ لیٹ کر دوبارہ اٹھ کر کام میں جٹ جاتیں، جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

ایک بار افغانستان کے صوبہ بامیان میں، جو خاصی اونچائی پر واقع ہے، انھیں نمونیا ہوگیا۔ جذام کے افغان کارکن محمد جمعہ نے انھیں لال کے مقام سے نیچے یاکولانگ تک پہنچایا۔ وہاں ان کی اتفاقیہ ملاقات اقوام متحدہ کے ایک ڈاکٹر سے ہوگئی۔ ڈاکٹر نے ان کے لیے ایک خصوصی طیارے کا بندوبست کیا جو انھیں کابل لایا اور وہ وہاں اقوام متحدہ کے اسپتال میں داخل ہوئیں۔ وہاں ایک ہفتہ رہنے کے بعد جب وہ صحت یاب ہوئیں تو اقوام متحدہ کے ایک اور طیارے کے ذریعے اسلام آباد پہنچیں۔ انھوں نے زندگی بھر اپنے لیے کوئی خصوصی سلوک طلب نہیں کیا تھا، چائے کی ایک فاضل پیالی تک نہیں۔ نہ کبھی انھوں نے اپنے لیے کوئی فالتو لباس خریدا۔ وہ جو کچھ بھی پہنتیں وہ کسی دوست، یا کمیونٹی کی ساتھی یا کسی ایسے مریض کا دیا ہوا تحفہ ہوتا جو اپنی صحت یابی سے خوش ہو کر انھیں تحفہ دینا چاہتا اور انکار کر کے جس کا دل توڑنا ان کے بس میں نہ ہوتا۔ ان کو ملنے والے طلائی تمغوں کا سونا بھی پگھلا کر جذام کے غریب مریضوں کی بیٹیوں کے جہیز کے زیوروں میں شامل کر دیا گیا تھا۔

اس وی آئی پی طیارے کی بیضوی کھڑکی سے نیچے پھیلے تیزی سے گزرتے ہوئے ویرانے کو دیکھ کر انھیں طیارے میں خود کو پا کر عجیب سا احساس ہوا۔ ٹھیک اس وقت اقوام متحدہ کا ایک اہلکار آ کر ان کے برابر میں بیٹھ گیا۔ ان سے مخاطب ہو کر اس نے دھیمی آواز میں کہا، ''آپ کو پتہ ہے، ہم لوگ آپس میں بات کر رہے تھے کہ صرف آج ہم اس اڑنے

والی مہنگی مشین پر ہونے والے خرچ کو باجواز سمجھ سکتے ہیں۔'' روتھ اس کی طرف دیکھ کر مسکرائیں۔ ان کی آنکھیں نم تھیں۔

لیکن ہر شخص اتنا مہربان نہیں تھا جتنا اس پرواز پر ملنے والا نوجوان افسر۔ اور وہ کلاشنکوف بردار فرقہ پرست جنگجو تو ہرگز نہیں جو ایک روز گلگت میں دریائے امفیری کے پار واقع جذام/ ٹی بی کے کلینک میں گھس آئے تھے۔ وہاں سب لوگ ایک لمبے تربیتی سیشن کے درمیانی وقفے میں بیٹھے ستا رہے تھے۔ ان قاتلوں کی خون آشام آنکھیں دیکھ کر روتھ لپک کر اپنی کرسی سے کھڑی ہو گئیں اور اپنے عملے کو بچانے کے لیے اپنی کڑھی ہوئی چادر ان پر تان دی۔ حملہ آوروں کو باتوں میں الجھا کر انھوں نے عملے کے ارکان سے اشارے میں وہاں سے بھاگ نکلنے کی التجا کی۔ حملہ آور وہاں سفید بالوں والی ایک غیر ملکی عورت کو دیکھ کر ٹھٹھا گئے تھے لیکن جلد ہی سنبھل گئے۔ جب انھوں نے روتھ کو زور کا دھکا دے کر فرش پر گرایا تو انھیں اپنے دائیں بازو میں شدید درد محسوس ہوا۔ انھیں لگا کہ انھیں گولیاں چلنے کی آواز اور چیخ پکار سنائی دی ہے، اور پھر سب کچھ دھندلا گیا۔ جب انھیں ہوش آیا تو غسلخانے سے خون بہہ کر باہر آ رہا تھا۔ وہ کسی طرح لڑکھڑاتی ہوئی قریب ترین فوجی چوکی تک پہنچیں۔ دو سینئر پیرامیڈیکل کارکن رشید اور شاہ دین بھی ان کے ساتھ ہو لیے۔ جب تک فوجی سپاہی کلینک میں پہنچے، قاتل غسلخانے میں جان بچا کر چھپے پانچ افراد کو قتل کر کے فرار ہو چکے تھے۔ مقتولوں میں عملے کے دو سینئر ارکان اور تین مریض شامل تھے۔ ڈاکٹر روتھ کا ٹوٹا ہوا بازو اگلے دن سے پہلے پلاسٹر میں نہ ڈالا جا سکا کیونکہ وہ باقی ماندہ عملے، مریضوں اور ان کے خاندان کی ڈھارس بندھانے میں مصروف تھیں۔

پاکستان کے جذام کے انسداد کے پروگرام کی کامیابی کے لیے روتھ نوجوان سرکاری پیرامیڈیکل کارکنوں کی مرہونِ منت تھیں جنھیں انھوں نے میری ایڈیلیڈ لیپرسی سینٹر کے

تربیتی مرکز میں تربیت دی تھی اور جواب پورے پاکستان میں انسدادِ جذام کے کلینک اپنی نگرانی میں چلا رہے تھے۔ وفاقی مشیر کے طور پر انھوں نے ان محنتی ساتھی کارکنوں کی محنت کو تسلیم کرنے اور انھیں ترقی دینے کے لیے ایک کریئر اسٹرکچر تیار کر کے حکومت کو پیش کیا۔ یہ پیرامیڈیکل کارکنوں کے زمرے کی بہبود کے لیے ملک میں اپنی قسم کا پہلا منصوبہ تھا اور اس سے صحت کے دوسرے شعبوں میں بھی اس طرح کی بہتری کی راہ کھل گئی۔

یہ نوجوان، جو غریب اور دیہی پس منظر رکھتے تھے اور جنھیں زندگی میں ترقی پانے کے موقعے بمشکل نصیب ہوتے تھے، اپنی تعلیم اور باعزت ہیلتھ ورکروں کے طور پر اپنی ترقی کے لیے ڈاکٹر روتھ کے احسان مند تھے۔ یہ خاتون ان کے لیے ماں سے بڑھ کر مہربان ثابت ہوئی تھیں۔ انھوں نے ان عام نوجوانوں کو اپنی اپنی کمیونٹی اور کام کی جگہ میں رہنماؤں کی صورت میں ڈھال دیا تھا۔ اور ان تجربے سے دونوں فریقوں کی شخصیت کو فیض حاصل ہوا تھا۔ انھوں نے ایک ایشیائی مسلم ثقافت کی اقدار کو جاننے کے عمل میں روتھ کی مدد کی تھی جسے وہ احترام کی نظر سے دیکھنے لگی تھیں۔

ان کی رہنمائی میں یہ نوجوان دوسری خواتین، اپنی ماؤں اور بیویوں کے خیالات کو بہتر طور پر قبول کرنے کے قابل ہوئے تھے۔ انھیں اپنی بیٹیوں کو تعلیم دینے کی ضرورت کا احساس ہوا تھا۔ اپنے کام کے دوران انھیں جمہوری شراکت اور دوسروں کو ذمے داریاں سونپنے کی ضرورت پڑی تھی۔ انھیں احساس ہونے لگا کہ دوسرے شخص کی غلطی معاف کرنا خود اپنے لیے بھی فائدہ مند ہوتا ہے۔ دوسروں کی خدمت کے عوض لازوال سکون اور مسرت حاصل کرنے کا فن بھی لوگوں نے ڈاکٹر روتھ فاؤ سے سیکھا تھا۔

دوسری طرف ڈاکٹر روتھ ان کے مضبوط عقائد، مستحکم خاندانی رشتوں، بزرگوں کے لیے ان کے احترام، خطرہ مول لینے پر آمادگی، دشواریوں کا سامنا کرنے کی جرأت اور کم

وسائل کے باوجود زندگی سے بھرپور لطف اٹھانے کی اہلیت کے لیے انھیں سراہتی تھیں۔ وہ ان کے خاندان کی عورتوں کی سخت کوشی کی معترف تھیں اور ان کے ننھے بچوں کی شرارتی معصومیت پر فدا تھیں۔ وہ ان کے ساتھ مل کر ان کی خوشیوں میں ہنسی اور غموں میں روئی تھیں۔ وہ ان کے حقوق کے لیے لڑی تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ یہ نوجوان انھیں ناامید نہیں کریں گے۔

۱۹۷۱ کی انڈو پاک جنگ کے نتیجے میں بنگلہ دیش ایک الگ ملک بن گیا اور کراچی میں بہاری پناہ گزینوں کا ایک ریلا آ پہنچا۔ ان میں سے بہت لوگ جذام کے مرض میں مبتلا تھے۔ کراچی کے سینئر لیپرسی سپروائزر عبدالعزیز اس چیلنج کا سامنا کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہنگامی امداد کا انتظام کیا گیا۔ اورنگی میں ایک خیمے میں چھوٹی سی ڈسپنسری کھولی گئی۔ آسٹریا سے گرٹروڈ ہسلین کے جمع کردہ فنڈ سے ایک رہائشی اسکیم شروع کی گئی۔ ان خاتون نے اپنے دوستوں کے خاندانوں سے فی خاندان ایک مکان کا خرچ فراہم کرنے کی درخواست کی تھی۔ اس فلاحی اسکیم کے تحت سینکڑوں مکان تعمیر کیے گئے۔

جب روتھ سندھ کے ریگستان کو پار کر کے کیرتھر پہاڑی سلسلے کے دامن میں واقع رنی کوٹ میں داخل ہوئیں تو سید عزادار حسین ان کے ساتھ تھے۔ تپتی دھوپ میں سروے کرنے کے نتیجے میں روتھ کی جلد پر آبلے پڑ گئے لیکن وہ خوش تھیں کہ ان کی ٹیم نے ریتیلے علاقے میں جذام کے گیارہ مریضوں کا پتہ چلا لیا تھا۔ رات میں وہ کھلے آسمان تلے کانٹے دار جھاڑیوں کے درمیان جیب میں پیاز رکھ کر سوتیں تاکہ زہریلے سانپوں کو دور رکھ سکیں۔

عبدالحمید شاہ نے جان ہتھیلی پر رکھ کر براہوی زبان بولنے والے مینگل قبیلے کے سردار سے اجازت حاصل کی کہ ڈاکٹر روتھ کی ٹیم بلوچستان کے خضدار ڈویژن میں واقع ان

کے علاقے پُرالی میں داخل ہو سکے۔ اجازت ملنے پر ٹیم پیدل وہاں داخل ہوئی۔ ایک پہاڑی ندی کے سوکھے ہوئے پاٹ کو پار کرتے ہوئے انھیں اچانک زور کی گرج سنائی دی۔ حمید شاہ نے مڑکر دیکھا تو پانی کے ایک زبردست ریلے کو اپنی سمت آتے دیکھا۔ انھوں نے روتھ کا ہاتھ تھاما اور دونوں دوڑ کر پاٹ کے دوسرے کنارے پر پہنچ گئے اور یوں اچانک پھوٹ پڑنے والے سیلاب میں غرق ہوتے ہوتے بچے۔ اگلے دن وہ سورج ڈوبنے تک پیدل چل کر جنگل کے سرے پر بنی جھونپڑی تک پہنچے جہاں مسخ چہرے اور گلے ہوئے ہاتھوں والی ایک عورت کو تنہا چھوڑ دیا گیا تھا۔ ان کے اس عورت کے پاس واقع کنویں سے پانی پینے اور اس کے ہاتھ کی بنی چپاتیاں کھانے کے سادہ عمل سے لوگوں کا خوف جاتا رہا اور اس عورت کو قبیلے میں دوبارہ شامل کرلیا گیا۔

۱۹۹۸ میں ایک بار پھر خضدار جانے والی سڑک پر حمید شاہ روتھ کے ساتھ تھے جب جرمنی میں ان کی والدہ کے انتقال کی خبر آئی۔ گاڑی واپس نہیں موڑی جاسکتی تھی۔ راستے کے اختتام پر مریض ان کے منتظر تھے۔ ماں بیٹی کی آخری ملاقات تقریباً چھ مہینے پہلے ہوئی تھی جب روتھ پچھلی بار اپنے آبائی وطن گئی تھیں۔ کسی نہ کسی طرح دونوں کو اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ وہ ایک دوسرے سے آخری بار مل رہی ہیں۔ یہ ایک پُرمسرت ملاقات تھی۔

۱۹۸۰ میں ملّا محمد انھیں طوفانی بارش اور برفباری میں سے گزارتے ہوئے شمال مغربی سرحدی صوبے کے لوئر دیر ضلع کے مقام سمرباغ لے گئے۔ اس موسم کا انتخاب ٹیم نے خاص طور پر اس لیے کیا تھا کہ وہاں کے زیادہ تر مردوں اور عورتوں سے ان کی ملاقات ہو سکے جو بعد میں پہاڑوں میں گم ہو جاتے ہیں۔ اس طرح خانہ بدوشوں کی ۹۸ فیصد آبادی کا سروے کیا جاسکا اور جذام کے تیس نئے مریضوں کی نشاندہی ہوئی۔ ایک رات گاؤں کی

جھونپڑی میں کھٹملوں نے روتھ کو سونے نہ دیا تو وہ تازہ ہوا میں سانس لینے باہر نکل آئیں، لیکن باہر نکلتے ہی پڑوسی کے کتے نے انھیں کاٹ لیا۔ اگلی صبح جب ملا محمد نے ریبیز سے بچاؤ کا ٹیکہ لگوانے کی تجویز پیش کی تو روتھ نے مسکرا کر انکار کر دیا۔ ''نہیں نہیں، یہ کوئی پاگل کتا نہیں۔ اس نے تو محض اپنا فرض ادا کیا۔''

۱۹۹۵ میں فسادزدہ کراچی شہر میں واقع ایشیا کی سب سے بڑی کچی آبادی اورنگی میں جب مخالف نسلی گروہوں نے ایک دوسرے پر فائرنگ شروع کر دی تو عبدالحمید انصاری، اطہر عالم اور ڈاکٹر روتھ کو بھاگ کر پناہ لینی پڑی۔ اس سے اگلے برس پورے پاکستان میں جذام کے مرض پر قابو پا لیا گیا، اور یہ منزل عالمی ادارۂ صحت کی طے کردہ تاریخ یعنی سنہ ۲۰۰۰ سے پورے چار سال پہلے حاصل ہوگئی۔ دسمبر ۲۰۰۰ تک ملک بھر میں پھیلے ہوئے ۱۷۰ مرکزوں میں جذام کے پچاس ہزار مریضوں کا اندراج کر لیا گیا تھا۔ تین سو پچیس پیرامیڈیکل کارکن، جن میں زیادہ تر سرکاری ملازم تھے، لیپرسی ٹیکنیشین کے طور پر تربیت پا کر فیلڈ میں کام کر رہے تھے۔

روتھ فاؤ کا خواب پورا ہو گیا تھا، لیکن وہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنے والی نہیں تھیں۔ شمالی علاقوں اور آزاد کشمیر میں ٹی بی پر قابو پانے اور سندھ، بلوچستان اور شمال مغربی سرحدی صوبے میں نابینا پن کو روکنے کے پروگراموں کی ابتدا کرنے کے بعد بھی انھوں نے اپنا سفر جاری رکھا۔ نوجوان پاکستانی ڈاکٹروں کو وہ اپنی ذمے داریاں اٹھانے کے قابل پہلے ہی بنا چکی تھیں۔

۱۲

جیسے آٹے میں نمک

وہ ایک نوجوان میڈیکل گریجویٹ تھا۔ ایک دوست کے مشورے پر اسے ۱۹۷۱ میں عملے میں شامل کیا گیا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ نوجوان ڈاکٹر ذہین اور اپنے کام میں ماہر تھا۔ اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا تھا کہ اسے مریضوں اور اسپتال کے عملے کا بہت خیال تھا۔ اس کی بنیاد یقیناً مضبوط تھی۔ لیکن بیشتر انسانی بنیادوں کی طرح، وہ اسی پرانے جال میں جا پھنسا۔ وہ خود کو طاقتور، طاقتور تر اور طاقتور ترین بنانا چاہتا تھا۔

روتھ نے اپنی ذات میں حد درجہ انکسار کی مثال قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔ پورے ادارے کے کسی کمرے کے باہر ان کے نام یا عہدے کی تختی لگی ہوئی نہیں تھی۔ جس کمرے میں وہ سوتی تھیں اور جس میں ان کی پرانی دُھرانی کپڑوں کی الماری رکھی تھی، اسی کو وہ اپنے دفتر کے طور پر بھی استعمال کرتیں۔ کونے میں رکھی واحد میز برسوں سے ان کے مینول ٹائپ رائٹر کو سنبھالے ہوئے تھی جس کی جگہ حال ہی میں ایک جرمن دوست سے تحفے میں ملے ہوئے کمپیوٹر نے لے لی تھی۔ صدر کے نام خط ہو یا امدادی اداروں کو شکریے کے رقعے، سب اسی دفتر سے لکھے جاتے۔ اپنی سیکرٹری بھی وہ خود تھیں اور اپنی ڈرائیور بھی۔

اپنے طرزِ زندگی کو دوسروں پر ٹھونسنے کی انھیں ہرگز خواہش نہ تھی لیکن جب انھوں نے اپنے ساتھ کام کرنے والوں کی پہل کاری کی حوصلہ شکنی ہوتے دیکھی تو انھیں بڑی بے اطمینانی محسوس ہوئی۔ انھیں اپنے وجدان سے پتہ چلا کہ ادارہ اپنے وقار سے محروم ہوتا جا رہا ہے۔

جرمن تعاون کار بہت دور تھے اور اس تصویر کو دیکھ نہیں سکتے تھے۔ پاکستانیوں کو آمرانہ نظام کاری کی عادت پڑی ہوئی تھی۔ انتظامی میٹنگوں میں ان کے برابر بیٹھے ہوئے ارکان بھی ان کی نیت پر کسی قدر شک کرنے لگے۔ ہوں... بڑھاپا، ارتکاز کی کمی... دفتری سیاست، بادشاہ گری... ارے نہیں، خدا کی پناہ!

روتھ نے گفتگو چھیڑی اور ممکنہ اقدامات کے بارے میں رائے طلب کی۔ وہ کوئی ایسا حل نکالنا چاہتی تھیں جس میں کسی کی سبکی نہ ہو۔ دوسرے شخص کو ہارتے ہوئے دیکھنے میں بھلا کیا لطف! اس کے باوجود چہرے سرخ ہوئے، نتھنے پھڑکے، میز پر زور زور سے ہاتھ مارے گئے اور پیر پٹخے گئے۔ زمین لرز اٹھی۔ روتھ اپنی جگہ سکون سے جمی بیٹھی رہیں، تبدیلی کو سہارا دینے کے لیے پُرعزم۔ افراد کو سیکھنے کی اور ادارے کو نمو پانے کی ضرورت تھی۔

آخرکار سنہ ۲۰۰۰ میں ایک موقع آیا۔ مذکورہ ڈاکٹر کا نام ایک کنسلٹینسی کے لیے تجویز کیا گیا۔ اس کی جگہ ایک سینئر رکن، جن کی سب عزت کرتے تھے، ۲۰۰۰ میں چیف ایگزیکٹو آفیسر بن گئے۔ چلتی ہوئی زبانیں بند ہو گئیں، حیرت زدہ آنکھیں تبدیلی کا مشاہدہ کرنے لگیں۔ ماما فاؤ کی دانش ایک بار پھر درست ثابت ہوئی تھی۔

راولپنڈی سے کراچی تک نوجوان منتظم اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے لگے۔ نوجوان پٹھان بیوہ گل پری ایک تربیت یافتہ فارماسسٹ کے طور پر اپنی جگہ سنبھال کر ادارے کو بھی بڑھنے میں مدد دینے لگیں اور اپنے دو بیٹوں کی پرورش بھی کرنے لگیں۔ انفرادی تخلیقی صلاحیت کو سراہا جانے لگا۔

نوں کے ایک چھوٹے سے گروپ کی قائم کی ہوئی ڈسپنسری نے ثابت کیا کہ وہ بڑھ کر ایک باوقار ادارہ بن چکی ہے، جس نے خود کو ایک این جی او کے طور پر منوایا جو ملک کے بڑے حصے میں جذام جیسے طویل المدت مرض کا مفت علاج فراہم کرتی ہے۔ اس نے این جی او اور حکومت کے درمیان شراکت کا ایک منفرد ماڈل پیش کیا اور ساتھ ہی ساتھ بین المذاہب رواداری اور ثقافتی افہام و تفہیم کی ایک مثال بھی قائم کی۔

کراچی میں ادارے کا ہیڈ کوارٹر ایک سات منزلہ عمارت میں قائم ہے جس میں مسلمانوں کے لیے مسجد اور مسیحیوں کے لیے ایک گرجا گھر بھی ہے۔ عید، کرسمس اور دیوالی کے تہوار عملے کے تمام مسلمان، مسیحی اور ہندو ارکان یکساں جوش کے ساتھ مل کر مناتے ہیں۔ جذام کے سالانہ دن کی تقریب قرآن مجید اور پھر انجیل کی آیات کی تلاوت سے شروع ہوتی ہے۔

اور بلاشبہ اس تقریب کو شروع کرنے کے لیے سسٹر برنیس وارگاس کی شرکت لازمی ہوتی ہے۔ وہ اپنی خراب صحت کے باوجود اسپتال کی فارمیسی کی دیکھ بھال کرنے کے لیے آج بھی ہر روز بلاناغہ آتی ہیں۔ سدا مسکراتے چہرے کے ساتھ انھیں کسی مریض کے پاس بیٹھنے اور عملے کے کسی رکن سے گپ شپ کرنے میں خوشی محسوس ہوتی ہے۔ انھیں ہمیشہ خیال رہتا ہے کہ دوائیں جہاں کہیں ان کی ضرورت ہو، پہنچیں اور بروقت پہنچیں، خواہ وہ تربت میں بچوں کے لیے آنکھوں میں ٹپکانے کے قطرے ہوں یا اسکردو میں مریضوں کے لیے ٹی بی کی دوا ہو، اگرچہ اب وہ اس بات پر خوش ہیں کہ انھوں نے میکلوڈ روڈ کی بستی کے ایک صحت یاب پٹھان مریض کی نوجوان اور تعلیم یافتہ بیٹی گل پری کو اپنے کام کی تربیت دے دی ہے۔

۱۳

چند ذاتی الفاظ

''میں آپ کو کیا بتاؤں کہ ان لوگوں نے ہمارے لیے کیا کیا ہے؟ انھوں نے کتنی محنت سے کام کیا اور اب بھی کر رہی ہیں۔ کراچی میں شدید بارشیں ہو رہی تھیں، لیکن انھوں نے کبھی ایک دن کا بھی ناغہ نہیں کیا۔ سسٹر وارگاس اور ڈاکٹر فاؤ گھٹنوں تک کھڑے گٹر کے گندے پانی میں سے گزر کر پہنچتی تھیں۔'' یوسف میکلوڈ روڈ کے دنوں کو اس طرح یاد کرتا ہے۔ یوسف ۱۹۵۴ میں ہندوستان کے صوبے آندھرا پردیش سے کراچی آیا تھا۔ جذام کا مریض ہونے کے باعث اس کے پاس جانے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ سو وہ میکلوڈ روڈ کی بستی میں رہ پڑا اور کوئی اور چارہ نہ پا کر بھیک مانگنے لگا۔

پھر یہ سسٹرز آئیں اور ڈسپنسری قائم ہو گئی۔ یوسف کا علاج کر کے اسے اسپتال ہی میں ہیلپر کے طور پر ملازمت دے دی گئی۔ اس نے جذام کی ایک اور صحت یاب مریضہ سے شادی کی اور اس کی تین بیٹیاں ہوئیں۔ بڑی بیٹی اب شادی شدہ ہے۔ چھوٹی دو بیٹیوں میں سے ایک مقامی اسکول کی پرنسپل ہے اور دوسری صحت کے ایک نامور ادارے میں کمپیوٹر پروگرامر کے طور پر کام کرتی ہے۔

یوسف اب اپنے مسخ شدہ ہاتھ پیروں کے ساتھ سکون سے گھر پر بیٹھتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ یہ سب میری ایڈیلیڈ لیپرسی سینٹر کی مدد کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ اس کی تین عزیز بیٹیاں تعلیم تو ہرگز حاصل نہیں کر سکتی تھیں، جو اب اپنی ذہانت اور محنت کی بدولت اس کا بڑھاپے کا سہارا ہیں۔

روتھ فاؤ کی بڑی بہن آرمگارڈ گونشوریک نے اپنے تاثرات اس طرح بیان کیے:

''مجھ سے روتھ کی زندگی کا خاکہ لکھنے کو کہا گیا تھا۔ میں اس کی سگی بہن ہوں، اس لیے ظاہر ہے مجھے اس کے بارے میں ہر شخص سے زیادہ علم ہونا چاہیے۔

''مگر میں سوچتی ہوں: اگر میں اس کی زندگی کی تفصیلات بیان کروں تو اس کے کیا معنی ہوں گے؟ ۱۹۲۹ میں (لائپزگ، جرمنی میں) ایک بالائی متوسط طبقے کے گھرانے میں پیدا ہوئی، جو چار بہنوں اور ایک بھائی پر مشتمل تھا۔ ہٹلر کی حکمرانی اور دوسری عالمی جنگ کے دوران بڑی ہوئی۔ ۱۹۴۸ میں جرمنی کے مغربی حصے کی طرف چلی آئی۔ ۱۹۵۷ میں اپنی طب کی تعلیم مکمل کر کے ۱۹۶۰ میں پاکستان آ گئی۔

''ایسے لوگ بہت سے ہیں جو اس کے بارے میں ان حقائق سے واقف ہیں، اور اس کی اپنے مقصد سے لگن اور اس کے کام کو جانتے ہیں، لیکن میں اس کی شخصیت کو ذرا مختلف انداز سے بیان کرنے کی کوشش کروں گی، اس طرح جیسے میں نے اسے بچپن کے دنوں سے جانا ہے۔ اگر کوئی پوچھے کہ روتھ کی شخصیت کی خاص باتیں کیا ہیں تو میرا جواب ہو گا: اس کی اپنے ساتھی انسانوں سے محبت، اپنے مقصد کو حاصل کرنے اور خوابوں کو حقیقت بنانے کی صلاحیت، اور آزادی کی خواہش۔

''اگر کوئی اس کی اپنے ساتھی انسانوں سے محبت اور اس کی صلاحیت کی بات کرتا

ہے، تو ضرور کرے۔ جہاں تک میرا سوال ہے، میں اس شے کی بات کروں گی جسے میں نے 'آزادی کی خواہش' کا نام دیا ہے۔ وہ پندرہ سال کی تھی جب اس نے خود کو زندگی میں پہلی بار آزاد محسوس کیا۔ دوسری عالمی جنگ ختم ہو چکی تھی اور اس کے ساتھ ہٹلر کی آمرانہ حکومت بھی۔

''مجھے اپریل ۱۹۴۵ کے وہ دن اچھی طرح یاد ہیں۔ اپنے زیادہ تر ہم وطنوں کی طرح ہم اپنا قریب قریب سب کچھ کھو بیٹھے تھے، ہمارے پاس کھانے کو کچھ نہ تھا، اسکول بند پڑے تھے، ایسی کوئی چیز باقی نہ بچی تھی جو زندگی کو پُرلطف بنا سکے۔ لیکن ہم آزاد تھے! ہم نے اپنی آزادی کا جشن منانے کے لیے اِدھر اُدھر کا سفر کر کے اپنے دوستوں سے ملنے کا قصد کیا، جن کی ہمیں عرصے سے کوئی خبر نہ ملی تھی کیونکہ ڈاک کا نظام معطّل ہو چکا تھا۔ پبلک ٹرانسپورٹ بہت کم تھی مگر ہم نے کسی نہ کسی طرح سفر کر ہی لیا۔

''پرانے، گھسے ہوئے سوٹ کیس میں رکھنے کے لیے کوئی سامان نہ تھا (اضافی کپڑے اور جوتے ہمارے پاس تھے ہی نہیں) سوائے کھانے کی چیزوں کے، کیونکہ ہمیں معلوم تھا کہ کوئی شخص ہمیں کچھ کھلا نہیں سکے گا۔ چنانچہ اس میں ہم نے اپنی خوراک رکھ لی جو محض آلوؤں اور چقندروں پر مشتمل تھی۔

''تین ہفتے میں یہ خوراک ختم ہو گئی، اور ہم خوش خوش لوٹ آئے۔ ہم نے اس سفر کا بے پناہ لطف اٹھایا۔ تمام دشواریوں، مسلسل برستی بارش، اور اپنے خالی پیٹوں کے باوجود، ہم جانتے تھے کہ ہم آزاد ہیں اور زندگی کا لطف اٹھانا ہمارے بس میں ہے۔ چنانچہ ہم نے فیصلہ کیا کہ اب ساری زندگی آزاد رہیں گے اور صرف وہ کام کریں گے جسے اپنی دانست میں درست کام سمجھیں گے۔

''ٹھیک تیس برس بعد (جب میں روتھ اور اس کے پروجیکٹ سے منسلک ہونے

کے لیے پاکستان پہنچی تھی)، ہم حیدر آباد میں ملے۔ ہم نے رات وہاں کے لیپرسی سینٹر میں گزاری، دریائے سندھ کا نظارہ کیا اور دل کھول کر ہنسے۔

''کیا ہمارے خواب پورے ہوئے؟ ہم نے ایک دوسرے سے دریافت کیا۔ آزادی سے زندہ رہنے کے اور اپنی پسند کا کام کرنے کے خواب۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ دریائے سندھ یورپی لوگوں کے لیے ایک خاص معنی رکھتا ہے۔ ہمیں اس کے بارے میں بچپن میں اسکول میں پڑھایا جاتا ہے، اور یورپ میں شاید ہی کوئی بچہ ہوگا جو بڑے ہو کر اس کا نظارہ کرنے کی خواہش نہ رکھتا ہو۔ آزادی، صرف اپنے لیے نہیں، بلکہ ایسی آزادی جو ہمیں دوسرے انسانوں کی مدد کے قابل بناتی ہو۔

''جیسا کہ میں نے کہا، آزادی غالباً ایسا لفظ ہے، جو روتھ کو سب سے زیادہ عزیز ہے۔ درحقیقت اپنے والد کے لائپزگ سے وائزباڈن ہجرت کرنے کے بعد وہ خاندان کی پہلی فرد تھی جو وہاں سے نکل آئی۔ والد ابھی تک روزگار کی تلاش میں تھے۔ یہ قدرت کا کرشمہ تھا کہ اس برطانوی فوجی نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا اور اسے مغربی جرمنی کی سرحد میں داخل ہونے دیا۔ وہ جنت میں اس مہربان شخص سے ملنے کی امید رکھتی ہے تاکہ اس کا ذاتی طور پر شکریہ ادا کر سکے۔

''اس نے تمام چیزوں کا لطف اٹھایا۔ اس نے جرمنی کے مغربی (آزاد) حصے میں اپنی تعلیم کا لطف اٹھایا۔ اس نے ان برسوں کا لطف اٹھایا جب اس کے پاس سفر کے لیے وقت اور موقع موجود تھا۔ سفر کے لیے، لوگوں سے ملنے کے لیے، انھیں دوست بنانے کے لیے۔

''اور مجھے ہمیشہ محسوس ہوتا ہے کہ ان برسوں نے اس کی زندگی پر بہت گہرا اثر چھوڑا، ان برسوں نے جن کا اس نے پورا لطف اٹھایا، کیونکہ اس سے اس کے فیصلے کی اہمیت

اور بڑھ جاتی ہے کہ اسے انسانوں کی خدمت کرنی ہے۔ اس کی وقعت اس لیے زیادہ ہے کہ یہ فیصلہ ایک مثبت رویے کے ساتھ کیا گیا تھا، کسی مایوسی یا ناکامی کے زیر اثر نہیں۔ اور اگر کوئی مجھ سے پوچھے تو میں کہوں گی کہ میں خوش ہوں کہ یہ فیصلہ خوش دلی کے ساتھ کیا گیا۔''

روتھ فاؤ کی قریبی دوست مسز والٹراڈ شرائینر نے ۲۸ ستمبر ۱۹۹۱ کو ویورز برگ میں ڈاکٹر فاؤ کو ڈیمین ڈٹن ایوارڈ پیش کیے جانے کے موقعے پر درج ذیل الفاظ کہے:

''پیارے دوستو!

''ہمارے معزز مہمان کی طرف سے ڈاکٹر روتھ فاؤ کو اعزاز اور امتیاز دیا جانا میرے لیے نہایت متاثر کن بات ہے۔ اس کی اہمیت اس لیے اور بھی زیادہ ہے کہ ہمارے 'فرینڈز آف کراچی' کے ارکان کو اس مسیحی مشن کے کام سے وابستہ رہنے، اسے قریب سے دیکھنے، اور اس کی اپنے وسائل اور عطیات کے ذریعے مدد کرنے کا تیس برس سے موقع ملتا رہا ہے۔

''ہماری سرگرمیوں کا مرکز ساورلینڈ کا علاقہ ہے جسے بعض اوقات 'قصباتی' بھی کہا جاتا ہے۔ شاید اس میں کوئی نقصان بھی نہیں کیونکہ ہمارے علاقے کے لوگوں کا، اور خدا کا شکر ہے کہ نوجوانوں کا بھی، جوش و خروش بڑے شہروں اور پرہجوم علاقوں میں رہنے والوں سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ بلکہ شاید اس کے برعکس کچھ زیادہ ہی ہے۔

''۱۹۴۶ اور ۱۹۴۷ کے درمیانی عرصے کی شدید سفاک سردیوں میں بہت سے لوگوں کی جان بچنا امریکہ اور مغربِ وسطیٰ کے قصباتی علاقوں، دیہات اور چھوٹے شہروں سے آنے والی امداد ہی کی بدولت ممکن ہوا تھا، بھلا ہم اسے کیسے بھول سکتے ہیں!

''میں آج آپ کو اطلاع دے سکتی ہوں کہ ہمارے فرینڈز سرکل کے ارکان کے عطیات بھیجنے کے جوش و خروش کے نتیجے میں ہم پچھلے تیس برس کے عرصے میں کئی ملین جرمن

مارک کی رقم اور اشیا پاکستان میں اپنی ڈاکٹر فاؤ کی سرگرمیوں میں شامل ہونے کے لیے مہیا کر چکے ہیں۔ لیکچر، بازار، اسکولوں کے میلے، یہاں تک کہ سیب کا رس بیچنے جیسی سرگرمیاں بھی ان نتائج میں مددگار ثابت ہوئیں۔ یہاں میں ۱۹۸۹ میں منعقد ہونے والے مشعل بردار مظاہرے کا خاص طور پر ذکر کروں گی جس کا عنوان تھا: 'لاکھوں جذامیوں کے لیے امید کی روشنی'۔

''یہ سب کس طرح شروع ہوا؟ روتھ فاؤ سے میری پہلی ملاقات ۱۹۵۶ میں ہوئی۔ ایک بڑے حادثے کے بعد میں ونٹر برگ اسپتال میں داخل تھی جب میری نگران ڈاکٹر نے اس ابتلا سے باہر نکلنے کے لیے حوصلہ کرنے پر اکسایا۔ اس کا نام تھا ڈاکٹر روتھ فاؤ۔

''۱۹۶۲ میں مجھے پاکستان سے آئے ہوئے ایک خط کو دیکھنے کا موقع ملا جس میں وہاں جذامیوں کی حالتِ زار بیان کی گئی تھی: ان کے لیے اسپتال ٹین کی ایک جھونپڑی میں قائم تھا اور نرسنگ اور علاج کے لیے درکار طبی سامان کی شدید کمی تھی۔ ڈاکٹر فاؤ اس زمانے میں جذام کی معالج بن گئی تھیں جب تیسری دنیا کے اسپتالوں میں جذامیوں کا داخلہ ایک ناممکن بات سمجھی جاتی تھی۔ پاکستان سے آنے والی یہ رپورٹ دہلا دینے والی تھی (جرمن محاورے میں یہ انسان کی کھال میں گھس جانے والی شے تھی)۔ اس کا مطلب تھا کہ فوراً کچھ کیا جانا ضروری تھا۔

''انسانی سماج کے ٹھکرائے ہوئے ان لوگوں کی ابتلا کے مقابلے میں، میں نے سوچا، میرے اپنے دکھ کتنے غیر اہم ہیں۔ چنانچہ ۱۹۶۱ کے شروع میں ونٹر برگ میں میرے ایک واقفکار نے اولین عطیات جمع کیے: دوائیں، سوتی کپڑے، اونی کمبل وغیرہ۔ فرائینول سے وورزبرگ تک میرے اولین رابطے، جرمنی کی انسدادِ جذام کی ایسوسی ایشن سے میری پہلی حوصلہ افزا ملاقات، دوستوں کو راغب کرنا، مختلف قسم کے وسائل اکٹھے کرنا،

صنعتی اداروں کو ساتھ ملا کر کلیسا کے ساتھ کام کرنا۔ ہم نے صحافیوں سے بھی رابطے کیے لیکن اس سلسلے میں سب سے اہم خود ڈاکٹر فاؤ کے اپنے تجربات کی رنگارنگ رپورٹیں تھیں جنھیں ہم اپنے سرکلر میں باقاعدگی سے شائع کیا کرتے اور جن کا عنوان ہوتا: 'ہم پاکستان میں جذامیوں کی مدد کرتے ہیں'، اور جن کا بہت اچھا اثر ہوا۔

''مختصر یہ کہ یہ تعاون جاری رہا اور اب بھی جاری ہے، جیسا کہ کہاوت ہے، ایک مبارک ستارے کی چھاؤں میں۔ نہیں، بلکہ خدا کی برکت کے سائے میں۔ کراچی کے دوستوں کے جرمن حلقے میں شامل ہم لوگ اپنی ڈاکٹر فاؤ کی سرگرمیوں کی ترقی میں اور زیادہ حصہ ڈالنا چاہتے ہیں، وہ جن کی کوششوں کو آج اتنے متاثر کن طریقے سے سراہا جا رہا ہے، تا کہ ہم سب اس مقصد تک پہنچ سکیں جس کی ہمیں امید ہے: عیسوی سن ۲۰۰۰ تک پاکستان میں جذام پر مکمل فتح۔''

ڈاکٹر روتھ فاؤ نے منگھوپیر نیوز لیٹر میں اپنے لفظوں میں لکھا کہ انھوں نے اپنی سترویں سالگرہ کیسے گزاری:

''میں کہاں سے شروع کروں؟

''ان تمام چھوٹے چھوٹے محبت بھرے اشاروں اور موقعوں کے ذکر سے جنھوں نے ۲۵ ستمبر کی آمد کا اعلان کیا؟ ناممکن: ان کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اگرچہ ان میں کسی کو بھلایا نہیں جا سکے گا۔ ان میں سے کچھ مثالیں یہ ہیں: اسٹاف کے نمائندوں نے سب سے پہلے آ کر اپنا تحفہ دیا: شلوار قمیص، زرد رنگ کی، جو میرا پسندیدہ رنگ ہے۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ میں اسے پہلی بار ۲۵ ستمبر کو پہنوں گی۔

''وہ اپنے ساتھ سالگرہ کا کارڈ بھی لائے تھے: 'ماں، تمھارے لیے، محبت کے

ساتھ۔ ماں وہ ہے جو مانگنے سے پہلے مدد کو پہنچتی ہے، جو کسی صلے کی توقع کے بغیر اپنی محبت دیتی ہے، اور سب سے بڑھ کر، ماں وہ ہے جس کی محبت کی کوئی انتہا نہیں۔'

''یوحنا کی انجیل کا یہ جملہ مجھے ہمیشہ مسحور کرتا ہے: 'اور جب اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ان سے محبت کرے گا، تو اس نے آخر تک ان سے محبت کی... آخر تک'۔

''میں نے جو زندگی گزاری ہے اس سے بہتر زندگی کا میں خواب میں بھی تصور نہیں کر سکتی تھی۔

''بعد میں ۲۵ ستمبر 1999 کو کیتھیڈرل میں عبادت۔ منبر پر چھ پادری تھے، ایک ساتھ خوشی کا اظہار کرتے ہوئے — ان میں سے ہر ایک کا ہمارے پروگرام سے کچھ نہ کچھ تعلق رہ چکا تھا — ہر ایک کے پاس اس کی اپنی کہانی تھی۔

کیتھیڈرل کرسیوں کی آخری قطار تک لوگوں سے بھرا ہوا تھا — مسیحی، مسلمان، ہندو، بودھ، پارسی۔ ساتھی کارکن، مریض، میری ایڈیلیڈ لیپرسی سینٹر کی مجلس عاملہ کے ارکان، دوست۔ اسلام آباد سے آیا ہوا مسلمان ساتھی کارکن الیاس عبادت پوری ہونے پر مجھ سے پوچھتا ہے: 'مجھے پتہ نہیں آپ سے یہ سوال کرنا چاہیے یا نہیں۔ یہ عبادت اس قدر پروقار اور خوبصورت تھی، لیکن اس کے باوجود اس میں کسی چیز کی کمی محسوس ہوتی تھی۔ آپ نے اتنی ساری شمعیں جلائیں لیکن ان سب کی روشنی صرف منبر تک محدود رہی۔ میں انتظار ہی کرتا رہ گیا کہ آپ ان میں سے کچھ شمعیں اٹھا کر ان کی روشنی ہمارے درمیان تقسیم کریں گی، تا کہ ہم مستقبل میں آپ کے مشعل بردار بن سکیں۔'

''ہماری ایک نوجوان سسٹر اور ہندو ساتھی کارکن جو یہ بات سن رہی تھی، اس نے اس بار ۲۵ ستمبر کو الیاس کے اس خیال کو عمل کا روپ دے دیا۔ جی ہاں، اسی ۲۵ ستمبر کو۔

''پولیس اور رینجرز نے وہ تمام سڑکیں جو اسپتال کی طرف جاتی ہیں، اپوزیشن کو اس

علاقے میں ایک مظاہرہ کرنے سے روکنے کے لیے بند کر رکھی تھیں جو اتفاق سے ۲۵ ستمبر ہی کو ہونا تھا۔ اور ادھر پوری ٹیم نے اس موقعے کے لیے اتنی تیاریاں کی تھیں! اور مریض اس تقریب کے اتنے دنوں سے بیتابی سے منتظر تھے!

''شام پانچ بجے، ٹریفک کے گزرنے کے لیے سڑکیں ذرا سی دیر کے لیے کھولی گئیں۔ ہم سب لپک کر تقریب کے مقام پر پہنچ گئے، اگرچہ وہاں پہنچنے کے بعد ہمیں گیٹ پر گھنٹہ بھر انتظار کرنا پڑا کیونکہ انتظامی کمیٹی نے اپنی تیاریاں ابھی پوری نہ کی تھیں۔

''شہر میں بدامنی ہونے کے باوجود آٹھ سو ساتھی کارکن اور مریض حفاظت سے وہاں پہنچ چکے تھے۔ نغمے، خاکے، کھیل، انگریزی اور اردو میں تقریریں۔ پھر ہم نے پھولوں کی پتیوں کی بوچھار اور خاندان کے افراد کی تالیوں کے درمیان بڑا سا کیک کاٹا — یہاں تک کہ آخر کار تقریب کا سب سے ناقابلِ فراموش لمحہ آپہنچا: شمعیں روشن کرنے کا لمحہ۔ سوامی ایک نہایت خوبصورتی سے سجی ہوئی ایک شمع مجھے تھماتا ہے، ہاشم (جذام کا ایک صحت یاب مریض) مجھے آگ پیش کرتا ہے — ہم شمع کو دونوں سروں سے جلاتے ہیں۔ میری اپنی زندگی بھی اسی طرح گزری ہے: دونوں سروں سے جلتی ہوئی ایک شمع کی طرح۔

''میری جلائی ہوئی شمع تاریک ہال میں پہلی روشنی ہے۔ لیکن جب میں اپنی آنکھیں اٹھاتی ہوں تو یہ روشنی پورے ہال میں پھیل چکی ہے، اس کے آخری کونے تک، اور وہاں سے باہر نکل کر راہداری اور زینے تک۔ بہت ساری شمعوں کی سنہری، پُرحرارت روشنی نے تاریک ہال کو روشنی، گرمجوشی اور امید کے ایک جگمگاتے جزیرے میں بدل دیا ہے۔

''انتظامی گروپ، جس نے اس پروگرام کے انعقاد کی ذمے داری پوری کی ہے، اپنی شمعیں بڑی احتیاط سے میری جلائی ہوئی شمع سے روشن کرتا ہے۔

''اس روشنی کو کوئی بجھا نہیں سکے گا — یہ وعدہ اس پوری شام کے دوران مجھے بے شمار

بار ہال کے ہر کونے سے اٹھتا سنائی دیتا ہے۔ اندھیرے کو کوسنے کے بجائے ایک شمع جلانا بہتر ہے۔ یا خدا، اس ٹیم کو اپنی رحمت اور حفاظت میں رکھنا۔

''باہر سڑک پر رینجرز کی گاڑیاں، اپنے گونج دار سائرن بجاتی ہوئی، زناٹے سے گزر رہی ہیں جبکہ ہر طرف جلی ہوئی بسیں، موٹر سائیکلیں اور کاریں بکھری ہوئی ہیں اور ہوا میں رہ رہ کر مشین گن کی فائرنگ کی آوازیں گونج رہی ہیں — اور اندر لیپرسی ٹیم اتحاد، امن اور مفاہمت کی تقریب منا رہی ہے۔

''سنی اور شیعہ، مسیحی اور ہندو، خاکروب اور منتظم، مریض اور صحتمند ساتھی کارکن اور دوست، ہندوستانی اور افغان مہاجر، سندھی اور پٹھان، بلوچ اور پنجابی۔ ان کے گھر والوں کو بھی بلایا گیا ہے، بیویاں اور بچے، دوسرے مردمہمانوں کے ساتھ — میں بہت خوش ہوں۔''
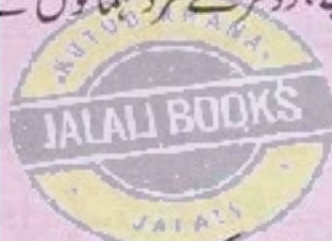
۱۱ اگست ۲۰۰۱ کو روزنامہ ڈان، کراچی، میں ''جذام کے علاج کے مراکز'' کے عنوان سے شائع ہونے والا ایڈیٹر کے نام ایک خط:

''میرا خط ۲۵ جولائی کے اخبار میں شائع ہونے والی ڈیرہ غازی خان کی شاہ صدر دین یونین کونسل کے ایک گاؤں کے رہنے والے تین بچوں کی تصویر کے حوالے سے ہے جو مبینہ طور پر جذام میں مبتلا ہیں۔

''ضلعی انتظامیہ کی تشکیل دی ہوئی ایک ٹیم نے جس میں چھ میڈیکل اسپیشلسٹ شامل تھے، گاؤں کا دورہ کیا اور تصدیق کی کہ مذکورہ خاندان کے افراد Xeroderma Pigmentosa نامی مرض میں مبتلا ہیں جو موروثی طور پر والدین سے اولاد کو منتقل ہوتا ہے۔ جذام کو خارج از امکان قرار دیا گیا۔

''اخبار ڈان نے حقائق کی چھان بین کیے بغیر ۲۸ جولائی کو ایک اداریہ 'جذام اب بھی ایک مسئلہ ہے' کے عنوان سے شائع کر دیا۔ جذام ایک قابلِ علاج مرض ہے اور 'سماجی بدنامی کا خوف' صرف اس وقت جنم لیتا ہے جب کسی شخص میں اس مرض کی باقاعدہ تشخیص ہو چکی ہو۔ اس اداریے میں اس بات کی بھی نشان دہی نہیں کی گئی کہ پاکستان میں اس مسئلے کا موثر حل موجود ہے۔

''اس سے میری مراد ڈاکٹر روتھ کے ایم فاؤ اور ان کے قائم کردہ میری ایڈیلیڈ لپرسی سینٹر سے ہے۔

''پچھلے سال، جب میں پولیٹکل ایجنٹ کے طور پر ڈیرہ غازی خان کے قبائلی علاقے میں تعینات تھا، میرا کیمپ کوہ سلیمان نامی سلسلے کے دور ترین پہاڑوں میں واقع تھا اور خشک سالی کی ریلیف کا کام جاری تھا۔ گھوڑے کی پیٹھ پر سفر کرنا آسان نہ تھا، چنانچہ میں اپنے انتظامی کام کے علاوہ دوائیں بھی ساتھ لے کر چلتا تھا تاکہ مفت میڈیکل کیمپ لگائے جاسکیں۔ ایسے ہی ایک دورے میں میں نے پانچ افراد میں جذام کے مرض کی تشخیص کی، جن میں میرا میزبان بھی شامل تھا جس کے چھپر کی چھت والی کاٹیج میں میں نے دو راتیں بسر کی تھیں۔

''مجھے ہمیشہ اپنے ڈی ایم جی آفیسر ہونے پر فخر رہا ہے جو پرانے کولونیل نظام کی آخری اور واحد اچھی باقیات ہے۔ اچھوتوں کے ساتھ رہنا اور جذامیوں کے ساتھ کھانا کھانا میرے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔

''تاہم میرے میزبان نے یہ کہہ کر میرے مبالغہ آمیز فخر کو دھچکا پہنچایا کہ اگرچہ اس ویرانے میں آکر ان کے ساتھ رہنے والا میں پہلا ڈی ایم جی آفیسر تھا، اور وہ بھی ان دشوار دنوں میں جب یہاں پینے کو پانی بھی دستیاب نہیں، لیکن میں وہاں آنے والا پہلا ڈاکٹر ہرگز

نہیں تھا۔

''چھ سال پہلے ایک 'سفید فام فرشتہ صفت خاتون' گھوڑے کی پیٹھ پر تین دن کا دشوار سفر کر کے اس سنگلاخ پہاڑی علاقے میں پہنچی تھی۔ اس نے جذامیوں کے مرض کی تشخیص کی تھی اور علاج کے لیے دوائیں دی تھیں۔ سب سے بڑھ کر اس نے انھیں، کم حیثیت خداؤں کے ان بچوں کو، امید عطا کی تھی کہ وہ نارمل انسانوں کی طرح رہ سکتے ہیں۔

''اب ڈاکٹر روتھ کے لیپرسی سینٹر کے پاس اس علاقے کے ۶۸ مریض رجسٹرڈ ہیں جن میں سے ۱۹ اب تک زیرِ علاج ہیں، جن میں میرا میزبان بھی شامل تھا۔

''پاک لوگوں کی اس سرزمین میں جرمنی کی ایک فرنگی عورت نے آ کر جذام کے خلاف جہاد برپا کیا ہے جبکہ خود ہمارے یہاں پیدا ہونے والی 'جہادی تنظیمیں' انسانیت کے خلاف جنگ میں مصروف ہیں۔ زندہ باد ڈاکٹر روتھ، خدا آپ پر مہربان ہو!''

ڈاکٹر راحیل احمد صدیقی، ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر (جنرل)، ڈیرہ غازی خان۔

۱۴

ساتھ ساتھ چلتے

اپنی کتاب To Light a Candle میں روتھ فاؤ ایک سوال اٹھاتی ہیں: ''کیا دو ایسے مذہبوں کے لیے جن میں سے ہر ایک کو ابدی سچائی پا لینے کا دعویٰ ہو، ایک دوسرے سے کوئی بامعنی مکالمہ کرنا ممکن ہے؟ اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔ میں صرف اپنی زندگی کے تجربات بیان کرسکتی ہوں۔'' اس کے بعد وہ لاہور کی بادشاہی مسجد کے اپنے دورے کا حال بیان کرتی ہیں جسے بادشاہ اورنگزیب نے شاہی قلعے کے سامنے ۱۶۷۴ میں بنوایا تھا۔ وہاں وہ مشہور وکیل اللہ بخش کریم بروہی کے ساتھ گئی تھیں۔

''میں ایک مسلمان دوست کے ساتھ وہاں گئی تھی۔ خاموش، خنک برآمدوں میں چپ چاپ چلتے اور دیواروں پر نازک نقاشی کی تحسین کرتے ہوئے میں اچانک مرکزی صحن میں آنکلی۔ وسیع، خالی صحن۔ لامحدودیت کا احساس۔ اور تین گنبد، محراب کے اوپر موتیوں کے ڈھیروں جیسے، بہت دور معلوم ہوتے ہوئے۔

''اس ناقابلِ تصور، واحد ہستی نے، جس کی شان میں یہ مسجد بنوائی گئی تھی، اچانک میرے وجود پر غلبہ پالیا، مجھے سحرزدہ کردیا۔ وہ ناقابلِ فہم ہستی فانی انسان کو اسی صورت میں

اپنا جلوہ دکھا سکتی تھی۔ میں نے اپنی مغربی پرورش سے پیدا ہونے والی تمام تر قوتِ ارادی سے کام لے کر خود کو گھٹنوں کے بل جھک کر رو پڑنے سے باز رکھا۔

"یہ وہ روحانی واردات تھی جو مجھ پر اپنے مسلمان دوست کے سامنے طاری ہوئی، اور جس نے میری روحانی زندگی پر گہرا نقش چھوڑا۔"

ہر صبح جب وہ میری ایڈیلیڈ لیپرسی سینٹر اسپتال کی دوسری منزل پر واقع اپنے ایک کمرے کے فلیٹ سے سیڑھیاں اتر کر، سادہ سوتی شلوار قمیص میں ملبوس، نیچے آتی ہیں تو دروازے کے پاس رک کر پٹھان چوکیدار غنچہ گل سے اپنی سلیس اردو میں مختصر سی گپ شپ کرتی ہیں۔ وہ بھی جذام کا ایک صحت یاب مریض ہے۔ پھر وہ اب تک سوئے ہوئے شہر کی گلیوں سے گزر کر سوا سو سال پرانے سینٹ پیٹرک کیتھیڈرل تک جاتی ہیں۔

راستے میں چیتھڑے پہنے والا ایک افغان ان کے پاس سے بے پروائی سے گزرتا ہے۔ سڑک کے کنارے سویا ہوا ایک نشئی ان کی طرف پیٹھ پھیر لیتا ہے۔ کونے پر ایک دبلا پتلا، متواتر کھانستا ہوا خوانچہ فروش فٹ پاتھ پر اپنا خوانچہ جما رہا ہے۔ پاس کی ایک جھونپڑی سے کسی ننھی بچی کے رونے کی آواز ہوا میں گونجتی ہے۔

ان کا دل لہو ہونے لگتا ہے۔ انھیں خواہش ہوتی ہے کہ کاش وہ اس سرزمین کے غریب باشندوں کے لیے اس سے کچھ زیادہ کر سکتیں، اس سرزمین کے لیے جس سے انھوں نے بے پناہ پیار کیا ہے۔

کیتھیڈرل کے محرابی ہال میں ان کا دبلا پتلا مختصر سا وجود بلند و بالا چوبی صلیب کے سامنے کھڑا ہوتا ہے۔ سر جھکائے، آنکھیں بند کیے، وہ دایاں ہاتھ اپنے سینے پر رکھے کپکپاتی ہوئی سرگوشی میں کہتی ہیں:

''یا خدا، میں تجھے پانے کے قابل نہیں

صرف ایک لفظ کہہ دے تا کہ میرے زخم بھر جائیں۔''

ایک نیا دن شروع ہو چکا ہے۔ خدا کے حکم پر عمل کرنے کا ایک اور دن۔ بیالیس برس پہلے کے اس دن کی طرح جب انھوں نے کراچی کے ایئر پورٹ پر پہلا قدم رکھا تھا۔ اور ان کے پاس زادِ راہ کے طور پر صرف تین چیزیں تھیں: ناداری، پاکیزگی اور اطاعت، اور کچھ نہیں، نہ اس سے زیادہ، نہ اس سے کم۔

ISBN 978-969-8380-90-8

Rs.200